www.alrisala.org

# الرسالہ

Al-Risala

April 2013 • No. 437 • Rs. 15

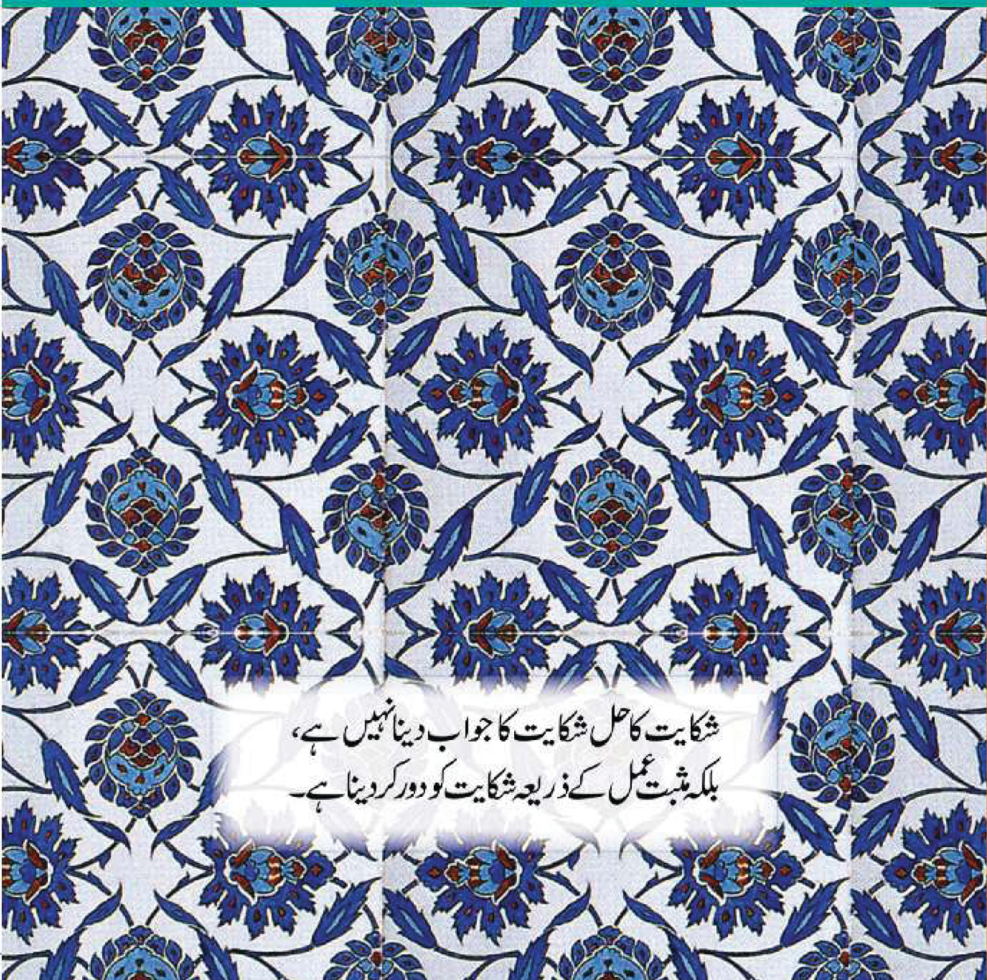

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Mob. 8588822679, 8588822680
Tel. 011-46521511, 41827083,
Fax: 011-45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹15
One year ₹150
Two years ₹ 300
Three years ₹ 450

By Registered Mail:
One year ₹400
Two years ₹ 800
Three years ₹1200
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

اپریل 2013

## فہرست

اسلام کی دریافت 2

ہدایت اور اظہارِ دین 20

دعوہ ایکٹوزم 27

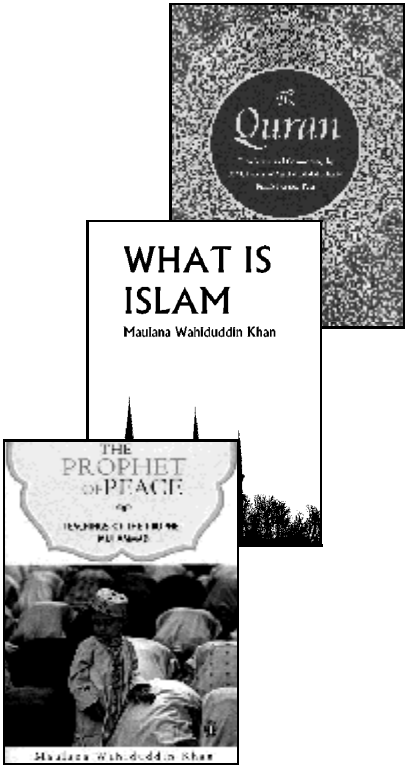

# اسلام کی دریافت

قرآن کی سورہ المائدہ میں ایک آیت ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے دورِ آخر میں نازل ہوئی۔ اس کا ایک حصہ یہ ہے: اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۭ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (5:3) یعنی آج منکر تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے، پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

قرآن کی اِس آیت میں اکمالِ دین یا تکمیلِ دین (completion of religion) سے مراد فہرستِ احکام کی تکمیل نہیں ہے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اسلام حکومتی معنوں میں غالب ہو گیا ہے۔ اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام کی راہ کے موانع (obstacles) ختم ہو گئے۔ خود آیت کے الفاظ سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ کیوں کہ آیت میں اکمالِ دین کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ اب خشیتِ انسانی (human fear) کا دور ختم ہو گیا۔ اب خدا کے دین کے حق میں ایسے اسباب جمع ہو گئے ہیں جو اُس کو اِس سے محفوظ کر دیتے ہیں کہ وہ ماضی کی طرح انسانی رکاوٹوں اور مذہبی جبر کا شکار بنے۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ہزاروں سال کے درمیان مسلسل پیغمبر آتے رہے (23:44)۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، کسی بھی پیغمبر کی تعلیمات محفوظ نہ رہ سکیں، حتی کہ اِن پیغمبروں کا مدوّن تاریخ (recorded history) میں کوئی ریفرنس بھی موجود نہیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ پیغمبروں کے مشن کو محفوظ رکھنے کے لیے جو تائیدی عناصر (supporting elements) درکار تھے، وہ ان کو حاصل نہ ہو سکے۔ پیغمبر آخر الزماں محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب کے ساتھ اللہ تعالی نے اِن تائیدات کو جمع کر دیا۔ اِس طرح یہ ممکن ہوا کہ آپ کی تعلیمات ابدی طور پر محفوظ ہو جائیں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں

اِسی معاملے کو اِن الفاظ میں بیان فرمایا کہ اب خدا کا دین خشتِ انسانی کے دور سے باہر آ گیا ہے۔

پچھلے پیغمبروں کی تعلیمات کے محفوظ نہ ہونے کا سبب کیا تھا، اس کا سبب یہ تھا کہ حفاظت کا یہ کام اسباب کے ذریعے ہوسکتا تھا۔ مگر پچھلے پیغمبروں کے ساتھ یہ اسباب جمع نہیں ہوئے۔ مثلاً کسی پیغمبر کا کام یا تو شخصی اعلان تک محدود رہا، یا یہ ہوا کہ صرف چند افراد اُن کا ساتھ دینے والے بنے، اور صرف چند افراد حفاظتِ دین کے لیے کافی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ساتھ ایک خصوصی معاملہ یہ کیا کہ پیشگی طور پر ایک موافق نسل تیار کی۔ نسل سازی کا یہ کام حضرت ابراہیم اور حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کے ذریعے عرب کے صحرا میں کیا گیا۔

عرب کے صحرا میں نسل سازی کا یہ مشن تقریباً ڈھائی ہزار سال تک چلتا رہا، اس کے بعد ایک نئی نسل تیار ہوئی جس کو بنو اسماعیل کہا جاتا ہے۔ اِسی نسل میں 570 عیسوی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔ اِس نسل کے درمیان آپ نے پیغمبر کی حیثیت سے تقریباً 23 سال تک کام کیا۔ ان میں سے عورتوں اور مردوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے دین میں داخل ہوگئی۔ اِس طرح وہ گروہ بنا جس کو اصحاب کہا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق، اصحابِ رسول (عورت اور مرد) کی تعداد تقریباً 2 لاکھ تھی۔ اصحابِ رسول کی اِسی جماعت کے ذریعے وہ موافق اسباب فراہم ہوئے جن کو ہم نے تائیدی عناصر (supporting elements) کا نام دیا ہے۔

## اصحابِ رسول کا رول

اصحابِ رسول کی یہی جماعت ہے جس نے پہلی بار اِس کو ممکن بنایا کہ خدا کے دین کا ایک محفوظ ایڈیشن تیار ہوگیا۔ اِس سلسلے میں اصحابِ رسول کے رول کے مختلف پہلو ہیں۔ اِس کا ایک پہلو یہ ہے کہ پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ایک تاریخی شخصیت بن جائے۔ قدیم دور میں جو پیغمبر آئے، اُن کی تعداد روایات میں تقریباً ایک لاکھ 24 ہزار بتائی گئی ہے، لیکن معروف تاریخی معیار کے مطابق، اِن میں سے کسی بھی پیغمبر کی حیثیت ''تاریخی پیغمبر'' کی نہیں ہے، حتی کہ حضرت مسیح جو پیغمبر اسلام سے قریب تر زمانے میں آئے، ان کے بارے میں بھی برٹرینڈ رسل (وفات: 1970)

نے لکھا ہے کہ — تاریخی طور پر یہ امر سخت مشتبہ ہے کہ مسیح کا کبھی وجود بھی تھا:

Historically, it is quite doubtful whether Christ ever existed at all. (*Why I Am Not A Christian,* 1967, Touchstone, UK, p. 266)

تاریخ میں پیغمبروں کا اندراج نہ ہونے کا سبب کیا تھا۔ اِس کا سبب تاریخ نگاری کا قدیم ذوق تھا۔ ابن خلدون (وفات: 1406) سے پہلے، تاریخ کو بادشاہوں کی تاریخ کے ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ قدیم پیغمبروں کے ساتھ چوں کہ حکومت اور سیاست کے واقعات جمع نہیں ہوئے، اِس لیے ان کو تاریخی طور پر ناقابلِ ذکر سمجھ لیا گیا۔

اِس صورتِ حال کو ختم کرنے کے لیے اللہ تعالی نے گویا مورخین (historians) کی ایک نئی نسل (generation) تیار کی۔ یہ صحابہ اور تابعین تھے جنھوں نے اِس معاملے میں عملاً وہ رول انجام دیا جس کو اِس سے پہلے پروفیشنل مورخین انجام دیتے تھے۔ صحابہ اور تابعین نے پیغمبر اسلام اور آپ کی تعلیمات سے متعلق تمام واقعات کا مستند ریکارڈ تیار کیا، پہلے حافظے کی صورت میں اور پھر تحریر کی صورت میں۔ یہی وہ محفوظ ریکارڈ ہے جس کو آج قرآن اور حدیث اور سیرت کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہ ریکارڈ پہلے صحابہ کے ذریعے تیار ہوا، پھر تابعین اور تبع تابعین کے ذریعے اس کا تسلسل جاری رہا۔ اِسی طرح امت کی بعد کی نسلوں نے اِس کام کی تدوین میں مزید کارنامے انجام دیے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا، یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں پریس کا دور آ گیا۔ اب پیغمبر اسلام اور آپ کے متعلق تمام معلومات کا تاریخی ریکارڈ مطبوعہ کتابوں کی صورت میں محفوظ ہو گیا۔ اِس طرح ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام کو استثنائی طور پر ایک مستند تاریخی پیغمبر کا درجہ حاصل ہو گیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس حیثیت کا اعتراف خود سیکولر مورخین نے کھلے طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر فرانسیسی مستشرق ارنسٹ رینان (Joseph Ernest Renan) جس کی وفات 1892 میں ہوئی، اس نے 1851 میں ایک مقالہ شائع کیا۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Muhammad and the Origins of Islam.

اِس مقالے میں ارنسٹ رینان نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخی حیثیت کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ — بڑے مذاہب کے دوسرے بانیوں کے برعکس، پیغمبر محمد واحد شخص ہیں جو کہ تاریخ کی کامل روشنی میں پیدا ہوئے:

Unlike the other founders of major religions, the Prophet Muhammad was born in the full light of history.

## پیغمبر اسلام کا مشن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی مشن کیا تھا، اس کو قرآن کی دو آیتوں میں اِس طرح بیان کیا گیا ہے: يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ، هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (61:8-9) یعنی وہ چاہتے ہیں کہ وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونک سے بجھا دیں، حالاں کہ اللہ اپنے نور کو ضرور مکمل کرے گا، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اللہ ہی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ، تاکہ وہ اس کو تمام دین پر غالب کر دے، خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی اِن آیتوں میں دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں: ہدی اور دین۔ اِسی کے ساتھ اِن میں دو اور لفظ استعمال کیے گئے ہیں: اتمام اور اظہار۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اتمام کا تعلق ہدی سے ہے اور اظہار کا تعلق دین سے۔ اِس میں دراصل اللہ کے دو مطلوب کا ذکر ہے۔ ایک ہے، نورِ ہدایت کا اتمام، اور دوسرا ہے، دین خداوندی کا اظہار و غلبہ۔

نورِ ہدایت کیا ہے، وہ اصلاً دو چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ دو چیزیں قرآن اور سنتِ رسول ہیں۔ قرآن، اللہ کے دین کا نظریاتی متن (ideological text) ہے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب تھا کہ قرآن کا مستند ہدایت نامہ اپنی کامل صورت میں محفوظ ہو جائے، تاکہ قیامت تک کے انسانوں کے لیے وہ خدائی ہدایت کو جاننے کا مستند ذریعہ ہو۔ اِس مطلوب الٰہی کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (15:9) یعنی قرآن کو ہم نے

اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

قرآن کی حفاظت مکمل طور پر ایک پرامن کام تھا۔ اللہ تعالی نے ایسے اسباب پیدا کیے کہ قرآن کامل طور پر ایک محفوظ کتاب بن جائے، تاکہ وہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے لیے خدا کی ہدایت کو معلوم کرنے کا مستند ماخذ بن سکے۔ یہ کام مکمل طور پر انجام پا گیا۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج پریس کے دور میں قرآن کے چھپے ہوئے نسخے تمام دنیا میں اس طرح موجود ہیں کہ ہر عورت اور مرد جب بھی چاہے، اس کو حاصل کر سکے۔

حفاظتِ قرآن کے اِس واقعے کا اعتراف سیکولر محققین نے بھی کھلے طور پر کیا ہے۔ مثال کے طور پر اسکاٹش مستشرق سر ولیم میور (Sir W. Muir) جس کی وفات 1905 میں ہوئی، اس نے قرآن کی بابت لکھا ہے کہ — غالباً دنیا میں کوئی دوسری کتاب ایسی موجود نہیں جو کہ 12 صدیوں تک اپنی کامل حفاظت کو برقرار رکھے:

There is probably, in the world, no book which has remained for 12 centuries with so pure a text.

(*The Life of Muhammad from Original Sources,* p. xxiii)

قرآن کے بعد، خدا کے نورِ ہدایت کا دوسرا جزو وہ ہے جس کو قرآن میں پیغمبر خدا کا اسوہ حسنہ (33:21) کہا گیا ہے، یعنی عملی اعتبار سے خدا پرستانہ زندگی گزارنے کا مستند نمونہ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک پُرازواقعات زندگی (eventful life) تھی۔ آپ کی زندگی میں ہر طرح کے حالات پیش آئے۔ آپ نے ہر صورت حال میں خدا پرستانہ زندگی کا عملی نمونہ قائم کیا۔ آپ کے اِس اعلیٰ نمونے کو قرآن میں خلقِ عظیم (68:4) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی زندگی کے یہ نمونے حدیث اور سیرت کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

اسلام کا یہ پہلو اتنا زیادہ واضح ہے کہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی ایک مثال برٹش اسکالر ڈیوڈ جارج ہاگرتھ (David George Hogarth) ہے، جس کی وفات 1927 میں ہوئی۔ اس نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کے بارے میں لکھا ہے کہ —

پیغمبر اسلام کا روزمرہ کا سلوک خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس نے ایسی حیثیت اختیار کر لی جس کی اب تک لاکھوں لوگ اہتمام کے ساتھ پیروی کر رہے ہیں۔ انسانی نسل کے کسی طبقے کا کوئی آدمی یہ درجہ حاصل نہ کر سکا کہ ایک معیاری انسان کی حیثیت سے اِس طرح اس کا کامل اتباع کیا جائے:

Serious or trivial, his daily behaviour has instituted a course which millions observe at this day with conscious mimicry. No one regarded by any section of the human race as perfect man has been imitated so minutely. (*Arabia,* p. 52)

ہُدی سے مراد نظریاتی ماڈل ہے۔ خدا کی ہدایت کا یہ نظریاتی ماڈل قرآن اور سنتِ رسول کی شکل میں مستند طور پر محفوظ ہو گیا ہے۔ یہ نظریاتی ماڈل اب ہمیشہ کے لیے پیغمبر کا بدل ہے۔

## اظہارِ دین

قرآن کی مذکورہ آیتوں میں دو چیزوں کا ذکر ہے — ہدی اور دین۔ دونوں کی حیثیت ایسے مطلوب کی ہے جن کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے ذریعے حاصل کرنا مقدر تھا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا معاملہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہدی سے مراد ایک نظریاتی مطلوب ہے، اور دین سے مراد ایک عملی مطلوب۔ جب قرآن کا متن محفوظ ہو گیا اور پیغمبر اسلام کا ماڈل حدیث اور سیرت کی کتابوں کے ذریعے مستند طور پر مدوّن ہو گیا تو اس کے بعد وہ مطلوب آخری طور پر حاصل ہو گیا جس کو آیت میں ہدی کے لفظ میں بیان کیا گیا تھا۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے سے اپنی ہدایت کا مستند ماخذ تیار کر دیا۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اِس خدائی ماخذ سے اپنے لیے ہدایت حاصل کرتا ہے یا ہدایت حاصل نہیں کرتا۔

اظہارِ دین کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ اِس معاملے میں اظہار، یعنی غلبہ مطلوب ہے، نہ کہ صرف نظریاتی معیار کا وجود میں آنا۔ اِس لیے اظہارِ دین سے ایک ایسا مطلوب مراد لیا جائے گا جو بالفعل وقوع میں آیا۔ بالفعل وقوع میں آنے سے کم درجے کی کوئی چیز اس کی تفسیر نہیں بن سکتی۔ اِس آیت میں اظہارِ دین سے حکومتی نظام یا قانونی نظام مراد نہیں لیا جا سکتا۔ اِس لیے کہ تاریخی طور پر یہ

بات ثابت ہے کہ پیغمبر اسلام کے زمانے میں یا آپ کے بعد کامل معنوں میں ایسا کوئی نظام نہیں بنا اور نہ بن سکتا ہے، اِس لیے کہ اِس دنیا کو اللہ تعالی نے انسانی آزادی کے اصول پر بنایا ہے (فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ) - ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ یہاں معیاری معنوں میں کوئی کامل نظام بنایا جا سکے۔ امتحان کی مصلحت کے تحت دی ہوئی انسانی آزادی اِس طرح کے معیاری نظام کو قائم کرنے میں حتمی طور پر مانع ہے۔ اِس دنیا میں جب آئڈیل کا حصول ممکن نہیں تو آئڈیل کے حصول کو نشانہ بنانا بھی درست نہیں ہو سکتا۔

ایسی حالت میں، اظہارِ دین کی آیت میں دین کے اظہار کی ایسی تفسیر کرنی پڑے گی جو عملی طور پر وقوع میں آئی ہو۔ اِس اعتبار سے غور کرتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت میں دین سے مراد شرعی دین نہیں ہے، بلکہ فطری دین ہے، اور اظہارِ دین کا مطلب ہے انسانی زندگی میں خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، حالتِ فطری کا قائم ہو جانا۔ دین کا یہ مفہوم قرآن کی ایک اور آیت میں موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: أَفَغَيْرَ دِينِ اللهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (3:83)۔ اِس آیت میں دین سے مراد دینِ شرعی نہیں ہے، بلکہ دینِ فطری ہے، یعنی وہ دین جس پر تمام کائنات بالفعل قائم ہے۔ یہ دین فطری کیا ہے، وہ قرآن کی اِس آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے: الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ (67:2) یعنی اللہ نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ وہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور اللہ بہت زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، انسان کو پیدا کر کے سیارہ ارض پر بسایا۔ انسان کو زمین پر بسانا بطور امتحان (test) تھا، تاکہ امتحانی حالات سے گزار کر احسن العمل افراد کا انتخاب کیا جائے، یعنی ایسے عورت اور مرد کا انتخاب جنھوں نے کامل آزادی کے باوجود اپنے آپ کو پوری طرح حدودِ الٰہی کا پابند بنایا، جنھوں نے اپنی آزادی کا غلط استعمال (misuse) نہیں کیا۔ یہی منتخب افراد وہ لوگ ہیں جن کو پوری تاریخ سے لے کر ابدی جنتوں میں بسایا جائے گا۔ زمین پر یہ آزادانہ ماحول اللہ کو

لازمی طور پر مطلوب ہے۔ آزادی کے اِس نظام کو کوئی بھی شخص یا گروہ اگر منسوخ (abolish) کرے تو اللہ ہرگز اس کو قبول نہیں کرے گا، وہ ایسے افراد یا گروہ کا لازماً خاتمہ کردے گا۔

## بادشاہت کے نظام کا خاتمہ

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت 610 عیسوی میں ہوئی۔ اُس وقت یہ حال تھا کہ ساری دنیا میں کچھ انسانوں نے بادشاہت کا نظام قائم کر دیا تھا۔ یہ شاہی نظام عملاً جبریت (despotism) کے ہم معنی تھا۔ اِس نظام نے انسانوں سے اُس آزادی کو چھین لیا تھا جو اللہ نے ان کو عطا کی تھی۔ یہ صورتِ حال اللہ کو مطلوب نہیں تھی، کیوں کہ وہ اللہ کے تخلیقی منصوبہ (creation plan of God) کی منسوخی کے ہم معنی تھا۔ اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ اِس جابرانہ نظام سے ٹکرا کر اس کو ختم کر دیں، تاکہ دنیا میں دوبارہ اللہ کی مطلوب حالتِ فطری قائم ہو جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو اُس زمانے میں ایک طرف عرب میں ملکی سطح پر قبائلی نظام تھا۔ اِس قبائلی نظام نے بھی عملاً انسانی آزادی کو ختم کر رکھا تھا۔ اِس صورتِ حال کا اشارہ قرآن کی مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے۔ مثلاً: اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (96:9) یعنی کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو منع کرتا ہے، ایک بندے کو جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو۔

پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کا پہلا ٹکراؤ اس قبائلی نظام سے ہوا۔ اِس کے نتیجے میں محدود نوعیت کی کچھ جنگیں (limited wars) پیش آئیں۔ آخر کار 6 ہجری میں مکہ فتح ہوا، جو عرب کے قبائلی نظام کا مرکز تھا۔ فتح مکہ کے بعد سارے عرب میں قبائل کا زور ٹوٹ گیا اور آزادی کی حالت قائم ہوگئی۔ فتح مکہ کے بعد اصحاب رسول کو غلبہ حاصل ہوگیا۔ اِس غلبہ کا مرکز مدینہ تھا۔ یہ غلبہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حکومت قائم ہونے کے ہم معنی نہ تھا، بلکہ وہ صرف یہ تھا کہ انتظامیہ (administration) قبائلی سرداروں کے ہاتھ سے نکل کر اصحابِ رسول کے ہاتھ میں آ گیا۔

اِس اعتبار سے دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ عرب کے باہر اُس وقت دو بڑی شہنشاہتیں (empires) قائم تھیں — ایک، ساسانی ایمپائر (Sassanid empire) اور دوسرے، بازنطینی ایمپائر

(Byzantine empire) - ساسانی ایمپائر کا دار السلطنت عراق کا قدیم شہر ساسانیان (Ctesiphon) تھا اور بازنتینی ایمپائر کا دار السلطنت ترکی کا شہر قسطنطنیہ (Constantinople) تھا۔ ساسانی ایمپائر دراصل اُس وقت کے رومن ایمپائر کا مشرقی بازو (eastern wing) تھا۔ یہ دونوں ایمپائر عرب کے قریب واقع تھے اور وہ اُس وقت کی دنیا میں بادشاہت پر مبنی جبری نظام کے نمائندے بنے ہوئے تھے۔ اِن دونوں ایمپائر نے اللہ کی دی ہوئی آزادی کو عملاً منسوخ کر رکھا تھا، جو کہ اللہ کو کسی حال میں مطلوب نہ تھا۔ بازنتینی سلطنت کا اقتدار 15 ملکوں پر تھا۔ اس کا خاتمہ 678 عیسوی میں ہوا۔ اور ساسانی سلطنت کا اقتدار 13 ملکوں پر تھا۔ اس کا خاتمہ 651 عیسوی میں ہوا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن حکمرانوں کو اپنے نمائندوں کے ذریعے خطوط بھیجے۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ حکمراں پر امن طور پر اپنے جابرانہ نظام کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ساسانی حکمراں نے آپ کے مکتوب کو اتنا حقیر سمجھا کہ اس نے اس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کا دونوں سے ٹکراؤ پیش آیا۔ اِس ٹکراؤ میں اللہ کی مدد پیغمبر اور اصحابِ پیغمبر کے ساتھ تھی، چناں چہ وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔

یہ ایک عظیم تاریخی واقعہ تھا، جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ چناں چہ اللہ نے ایک اسرائیلی پیغمبر حبقوق کے ذریعے اس کی پیشگی خبر دے دی تھی جو موجودہ بائبل میں بدستور موجود ہے۔ اِس پیشگی خبر کے الفاظ یہ ہیں — وہ کھڑا ہوا اور زمین تھرا گئی۔ اس نے نگاہ کی اور قومیں پراگندہ ہو گئیں۔ ازلی پہاڑ پارہ پارہ ہو گئے۔ قدیم ٹیلے جھک گئے۔ اس کی راہیں ازلی ہیں:

He stood and measured the earth; He looked and startled the nations. And the everlasting mountains were scattered, the perpetual hills bowed. His ways are everlasting (Habakkuk 3:6)

مذکورہ بیان میں ''وہ'' سے مراد پیغمبر اسلام ہیں، اور ''پہاڑیوں'' سے مراد سیاسی پہاڑیاں ہیں، یعنی ساسانی ایمپائر اور بازنتینی ایمپائر۔ ''اس کی راہیں ازلی ہیں'' سے مراد ہے خدا کے دین کا ابدی طور پر

محفوظ ہوجانا۔ بائبل کی یہ پیشین گوئی پیغمبر اسلام کے ذریعے کامل طور پر پوری ہوئی۔

## نئے دور کا آغاز

جبر پر مبنی مذکورہ دونوں سیاسی ایمپائر کا خاتمہ ساتویں صدی عیسوی میں ہوا۔ یہ دونوں ایمپائر آزادانہ ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ جب یہ دونوں ایمپائر ختم ہوئے تو دنیا میں آزادی کا ایک نیا دور آیا۔ اِس نئے دور کے حالات نہ صرف مسلم مورخین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، بلکہ سیکولر مورخین نے بھی کھلے طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔

اِنھیں سیکولر مورخین میں سے ایک فرانسیسی مورخ ہنری پرین (Henri Pirenne) ہے، جس کی وفات 1935 میں ہوئی۔ ہنری پرین نے اپنے مطالعے کے نتیجے میں کھلے طور پر اِس تاریخی حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ہنری پرین نے لکھا ہے کہ ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر نے دنیا میں مطلق شہنشاہیت (monarchical absolutism) کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ اصحابِ رسول نے اپنی غیر معمولی قربانی کے ذریعے اِس نظام کو توڑ دیا۔ اِس واقعے کے نتیجے میں تاریخ میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ ہنری پرین کے الفاظ میں — اسلام نے زمین کے نقشے کو بدل دیا۔ تاریخ کے روایتی نظام کا خاتمہ ہوگیا:

Islam changed the face of the globe. The traditional order of history was overthrown. (*History of Western Europe*, p. 46)

ساتویں صدی عیسوی میں جب سیاسی جبر کے نظام کا خاتمہ کیا گیا تو اس کے بعد دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا۔ یہ انقلاب فوری نتیجے کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ ایک پراسس (process) کی حیثیت رکھتا تھا۔ اِس کے بعد انسانی زندگی میں پہلی بار ایک نیا تاریخی عمل (historical process) شروع ہوا۔ یہ تاریخی پراسس برابر چلتا رہا، یہاں تک کہ وہ اپنے آخری نقطہ انتہا (culmination) تک پہنچ گیا۔ یہ آخری نقطہ انتہا وہی ہے جس کو عام طور پر مغربی تہذیب (western civilization) کہا جاتا ہے۔ اِس تاریخی عمل کے دو بڑے دھارے تھے — ایک، وہ جس کو جدید اصطلاح میں، جمہوریت (democracy) کہا جاسکتا ہے۔ اور دوسرا، وہ جس کو جدید ٹکنالوجی پر مبنی صنعت کہنا درست ہوگا۔

عام طور پر مسلم علما مغربی تہذیب کے بعض ناپسندیدہ پہلو کو دیکھ کر اس کے بارے میں منفی ہو گئے ہیں، مگر یہ ناپسندیدہ پہلو دراصل مغربی تہذیب کا کلچرل پہلو ہے، وہی اصل مغربی تہذیب نہیں ہے۔ اصل مغربی تہذیب اپنی حقیقت کے اعتبار سے، وہی چیز ہے جس کو ہم نے خدا کے دین کے حق میں تائیدی عنصر کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔

## جمہوریت کا دور

اہلِ علم کے درمیان عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ موجودہ زمانے میں سماجی اور سیاسی نظام (socio-political system) کے اعتبار سے جو ترقیاں ہوئی ہیں، اُن سب کی بنیاد جمہوریت ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دراصل انقلاب فرانس (1789) تھا جس کے بعد دنیا میں جمہوریت کا دور آیا، مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ انقلاب فرانس (French Revolution) ایک تاریخی عمل کا نقطہ انتہا تھا۔ یہ تاریخی عمل انقلاب فرانس سے بہت پہلے عرب میں اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہوا۔

قرآن میں اِس معاملے میں یہ اصولی حکم اِن الفاظ میں دیا گیا تھا: أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42:38) یعنی وہ اپنا کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں:

Their affairs are decided by mutual consultation.

وہ چیز جس کو موجودہ زمانے میں نظام جمہوریت کہا جاتا ہے، اُسی کو قرآن میں نظامِ شوری کہا گیا ہے۔ شوری کا یہ تصور اسلام کے اجتماعی نظام کی بنیاد ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کا جو اجتماعی نظام بنا، اس کو عام طور پر خلافت کہا جاتا ہے۔ اِس خلافت کا اگر دوسرا نام تجویز کرنا ہو تو یقیناً وہ جمہوری خلافت ہوگا۔ اِس معاملے کی ایک مثال خلیفہ ثانی عمر فاروق (وفات: 644ء) کا ایک واقعہ ہے۔ اِس واقعے کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''خلیفہ دوم عمر فاروق کے زمانے میں عمرو بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک بار گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اِس دور میں گورنر کے بیٹے کا گھوڑا بھی شریک تھا، مگر جب دوڑ ہوئی تو ایک مصری (غیر مسلم) کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ مصری نے فتح کے جوش میں کوئی ایسا جملہ کہا جو

گورنر کے صاحب زادے (محمد بن عمرو بن العاص) کو برا معلوم ہوا اور انھوں نے مذکورہ مصری کو کوڑے سے مار دیا۔ مارتے ہوئے ان کی زبان سے نکلا: خذها وأنا ابن الأكرمين (یہ لو، اور میں شریفوں کی اولاد ہوں)۔حضرت انس بن مالک اِس قصے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مذکورہ مصری اِس کے بعد مصر سے چل کر مدینہ پہنچا اور خلیفہ عمر فاروق سے شکایت کی کہ گورنر کے لڑکے نے اس طرح اس کو کوڑے سے مارا ہے۔حضرت عمر نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو، اور فوراً اپنے ایک خاص آدمی کو مصر بھیجا کہ عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو جس حال میں ہوں، اسی حال میں ان کو لے کر مدینہ آؤ۔ چناں چہ وہ لوگ مدینہ لائے گئے۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو خلیفہ عمر نے فرمایا: أين المصري، دونك الدرة فاضرب بها ابنَ الأكرمين (مصری کہاں ہے۔یہ کوڑا لو اور اس سے شریف زادہ کو مارو)۔اس کے بعد مصری نے کوڑا لیا اور گورنر مصر کے سامنے ان کے صاحب زادہ کو مارنا شروع کیا۔وہ مارتا رہا، یہاں تک کہ ان کو زخمی کر دیا۔خلیفہ عمر درمیان میں کہتے جاتے تھے کہ شریف زادہ کو مارو۔جب وہ خوب مار چکا تو خلیفہ عمر فاروق نے کہا کہ ان کے والد عمرو بن العاص کے سر پر بھی ایک کوڑا مارو، کیوں کہ خدا کی قسم، ان کے بیٹے نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے زور پر تم کو مارا (فو الله ما ضربك ابنه إلا بفضل سلطانه)۔مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین، جس نے مجھ کو مارا تھا، اس کو میں نے مار لیا۔اِس سے زیادہ کی مجھے حاجت نہیں۔ خلیفہ عمر نے کہا: خدا کی قسم، اگر تم ان کو بھی مارتے تو ہم تمھارے اور ان کے درمیان حائل نہ ہوتے، یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔پھر آپ نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا: يا عمرو، متى استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحراراً (اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ اُن کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا)''۔ سيرة عمر بن الخطاب، علي محمد الصلابّي (1/306)

ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی انقلاب کے تحت پیدا ہونے والا یہ جمہوری پراسس

(democratic process) تاریخ میں سفر کرتا رہا۔ آخری کار وہ مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے مغربی یورپ پہنچا۔ خلیفہ عمر فاروق کے مذکورہ واقعے کے تقریباً 11 سو سال بعد فرانس کے جمہوری مفکر روسو (Jean Jacques Rosseau) نے اپنی مشہور کتاب سوشل کنٹریکٹ (*Contract Social*) 1762 میں شائع کی۔ اِس کتاب کا پہلا جملہ خلیفہ عمر فاروق کے قول کی بازگشت تھا۔ کتاب کا وہ پہلا جملہ یہ تھا — انسان آزاد پیدا ہوا تھا، لیکن میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں:

Man was born free, but I see him in chains.

پیغمبر اسلام کی وفات کے تقریباً 30 سال بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ شورائی خلافت اپنے ڈھانچے کے اعتبار سے، ایک خاندانی خلافت بن گئی، لیکن اسلامی انقلاب کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ اِس ظاہری تبدیلی کے باوجود خلافت کا جمہوری مزاج بدستور باقی رہا۔ اِس معاملے کی بہت سی مثالیں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بطور مثال یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

## ہارون رشید کا ایک واقعہ

ہارون رشید عباسی دور کا پانچواں خلیفہ ہے۔ وہ 766 میں پیدا ہوا اور 809 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: وذُكر أن يهودياً كانت له حاجة عند هارون الرشيد، فاختلف إلى بابه سنةً، فلم يقض حاجته، فوقف يوماً على الباب- فلما خرج هارون سعى حتى وقف بين يديه وقال: اتق الله يا أمير المؤمنين، فنزل هارون عن دابته وخرّ ساجداً- فلما رفع رأسه أمر بحاجته فقضيت- فلما رجع قيل له: يا أمير المؤمنين، نزلت عن دابتك لقول يهوديّ- قال: لا، ولكن تذكرتُ قولَ الله تعالى: وإذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم، فحسبه جهنم، ولبئس المهاد- (تفسير القرطبي، 19/3) یعنی کہا جاتا ہے کہ ایک یہودی تھا جس کو ہارون رشید سے ایک کام تھا۔ وہ شخص اِس کام کے لیے خلیفہ کے دروازے پر ایک سال تک جاتا رہا، مگر خلیفہ نے اس کی ضرورت پوری نہ کی، پھر ایک دن وہ یہودی، خلیفہ کے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ جب ہارون رشید باہر نکلا تو وہ شخص تیزی سے آ کر خلیفہ کے سامنے کھڑا ہو گیا،

اور کہا—اے امیر المومنین، اللہ سے ڈریئے۔ یہ سن کر ہارون رشید اپنی سواری سے اترا اور سجدے میں گر پڑا۔ پھر ہارون رشید نے سجدے سے سر اٹھایا اور اس نے حکم دیا اور یہودی کی ضرورت پوری کر دی گئی۔ پھر جب ہارون رشید لوٹا تو اس سے کہا گیا کہ اے امیر المومنین، کیا آپ ایک یہودی کے قول پر اپنی سواری سے اتر گئے۔ ہارون رشید نے کہا کہ نہیں، بلکہ مجھے اللہ تعالی کا یہ قول یاد آیا: وإذا قيل له اتق الله أخذته العزة بالإثم فحسبه جهنم، ولبئس المهاد (2:206)

ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی انقلاب آیا، اس کے بعد تاریخ میں جو پراسس جاری ہوا، اس کا دوسرا پہلو وہ تھا جس کو ہم نے جدید ٹکنالوجی پر مبنی صنعت کہا ہے۔ یہ دوسرا پراسس خاص طور پر عباسی عہد (750-1258) میں بغداد میں شروع ہوا، پھر وہ مختلف مراحل سے گزرتا ہوا اسپین پہنچا۔ اسپین میں اس نے غیر معمولی ترقی حاصل کی۔ اسپین کی مسلم خلافت 711 میں شروع ہوئی اور 1492 میں ختم ہوئی۔ اِس مدت میں جو سائنسی ترقیاں ہوئیں، وہی مغرب کے صنعتی انقلاب کی بنیاد بنیں۔ مسلم خلافت کے زمانے میں سائنس میں جو ترقی ہوئی، اس کے بغیر مغرب میں سائنس کی ترقی ممکن نہ ہوتی۔ مورخین نے اس واقعے کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے۔ اس کی ایک مثال رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) کی ہے۔ وہ فرانس میں پیدا ہوا اور لندن میں اس کی وفات ہوئی۔ بریفالٹ نے مغرب کی نشاۃِ ثانیہ سے پہلے عربوں کے سائنسی رول کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ —یہ بہت زیادہ قابلِ قیاس بات ہے کہ عربوں کے رول کے بغیر یورپ کی جدید صنعتی تہذیب ہرگز کبھی وجود میں نہ آتی:

'It is highly probable that but for the Arabs modern European civilization would never have arisen at all'. Robert Briffault (1876-1948)

(*The Making of Humanity*, p.190, published in 1919; publisher: G. Allen & Unwin Ltd, UK, pp. 371)

اس طرح کی رائیں کئی اور مغربی اسکالروں نے دی ہیں۔ مثلاً برٹرنڈ رسل، فیلڈنگ گیرسن (Fielding Garrison)، برناڈ لوئی (Bernard Lewis)، وِل ڈیورنٹ (Will Durant)،

وغیرہ۔ یہاں وِل ڈیورنٹ کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

Muslim scientists helped in laying the foundations for an experimental science with their contributions to the scientific method and their empirical, experimental and quantitative approach to scientific study. (*The Age of Faith*, by Will Durant (1980), 4/162

یعنی مسلم سائنس دانوں نے سائنٹفک طریقِ عمل میں اپنے کنٹری بیوشن اور اپنے تجرباتی اور کمیاتی منہج کے ذریعے سائنسی مطالعے کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔

## اسلامی تحریک اکیسویں صدی میں

قرآن کی مذکورہ آیات (61:8-9) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کو رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے جو انقلاب مطلوب تھا، اُس انقلاب کے دو حصے تھے — ایک، اتمامِ نور، اور دوسرے، اظہارِ دین۔ اب اکیسویں صدی میں یہ دونوں مطلوب چیزیں پوری طرح واقعہ بن چکی ہیں۔ اِس طرح اب اسلامی تحریک اپنے فائنل دور میں پہنچ چکی ہے۔ اب فائنل رول اہلِ ایمان کو ادا کرنا ہے۔ اب اہلِ ایمان کا کام ہے کہ وہ اِس تاریخی انقلاب کو سمجھیں اور اس کے ذریعے پیدا ہونے والے امکانات (opportunities) کو بھرپور طور پر استعمال کریں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اِس مطلوب خداوندی کا ایک پہلو وہ تھا جس کو قرآن میں، اتمامِ نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اتمامِ نور سے مراد ایک ایسا واقعہ ہے جو اپنی حقیقت کے اعتبار سے، پوری طرح ایک پرامن اور غیر سیاسی واقعہ ہے، اور وہ ہے خدا کے دین کے مستند ایڈیشن کا پوری طرح محفوظ ہو جانا۔ یہ واقعہ اِس طرح انجام پا چکا ہے کہ خدا کی کتاب (قرآن) کا متن (text) کامل طور پر محفوظ ہو چکا ہے۔ اِسی کے ساتھ پرنٹنگ پریس کا دور دنیا میں آ گیا ہے۔ اِس طرح یہ ممکن ہو گیا ہے کہ قرآن کا متن اور اس کے ترجمے تیار کر کے ہر زبان میں شائع کیے جائیں اور اس کو تمام اقوامِ عالم تک پہنچا دیا جائے۔

اِس سلسلے میں دوسرا مطلوب وہ ہے جس کو قرآن میں اظہارِ دین کہا گیا ہے، یعنی دین کو غلبہ کی حیثیت مل جانا۔ یہ دوسرا مطلوب بھی اکیسویں صدی میں پوری طرح حاصل ہو گیا ہے۔ اب اہلِ ایمان کو صرف

یہ کرنا ہے کہ وہ اظہارِ دین کے ذریعے حاصل ہونے والے مواقع کو بھرپور استعمال کریں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اظہارِ دین سے مقصود یہ تھا کہ دنیا میں وہ حالتِ فطری قائم ہوجائے۔ یہ واقعہ بھی پوری طرح انجام پاچکا ہے۔ اب دنیا میں پوری طرح مذہبی آزادی آچکی ہے۔ کسی بھی رکاوٹ کے بغیر دنیا کے کسی ملک میں دعوتی مشن کو جاری کرنا ممکن ہوگیا ہے۔ اِس انقلاب کے بعد تاریخ میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ انسانی تاریخ میں تلوار کا دور ختم ہوگیا۔ اب صرف پُرامن عمل کا دور ہے۔ تاریخ کا یہ دور عین دعوتی مشن کے حق میں ہے۔

اظہارِ دین، یعنی دنیا میں حالتِ فطری کے قائم ہونے کی بنا پر بہت سے موافق حالات وجود میں آئے ہیں۔ اِن میں سے دو بے حد اہم ہیں۔ اِن میں سے ایک ہے، کائنات میں چھپی ہوئی اللہ کی نشانیوں کا دریافت ہوجانا۔ اور دوسرا ہے، جدید مواصلات (modern communication) جس نے تاریخ میں پہلی بار اُس عالمی مشن کو مکمل کرنے کا موقع فراہم کیا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (25:1)

## آیاتِ الٰہی کا ظہور

آیات اللہ یا آیاتِ معرفت کا ظہور پیشگی طور پر مقدر تھا۔ قرآن میں اِس کی پیشین گوئی اِن الفاظ میں کی گئی تھی: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔ قرآن کی اِس آیت میں جس چیز کو آفاق وانفس میں نشانیوں کا ظہور بتایا گیا ہے، وہ دراصل دورِ جدید میں نظریاتی سائنس کے ذریعے دریافت ہونے والے حقائقِ فطرت ہیں۔ اِن حقائق نے دورِ جدید میں معرفتِ خداوندی کے نئے دروازے کھول دئے ہیں۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ تخلیقاتِ الٰہیہ میں کمالاتِ الٰہیہ کو دیکھے اور معرفتِ خداوندی کا اعلیٰ درجہ حاصل کرے۔ نیز اِسی کے ذریعے یہ بھی ممکن ہوگیا ہے کہ اِن حقائق فطرت کو دعوت الی اللہ کے عمل میں جدید دلائل کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اِس طرح دعوت کے عمل کو خود انسان کے علمی مسلّمہ کے مطابق، ثابت شدہ بنا دیا جائے۔

اِس سائنسی انقلاب کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو موجودہ زمانے میں دورِ مواصلات (age of communication) کہا جاتا ہے۔ اِس دورِ مواصلات نے تاریخ میں پہلی بار

اِس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ دعوت الی اللہ کے اُس عالمی نشانے کو پورا کیا جا سکے جس کی پیشین گوئی ایک حدیث رسول میں اِن الفاظ میں کی گئی تھی: لا یبقی علی ظهر الأرض بیت مدر و لا وبر إلا أدخله الله کلمة الإسلام، بعزّ عزیز و ذلّ ذلیل (زمین کی پشت پر کوئی چھوٹا یا بڑا گھر باقی نہیں رہے گا، جہاں اللہ اسلام کا کلمہ نہ پہنچا دے، عزت والے کو عزت کے ساتھ اور ذلت والے کو ذلت کے ساتھ، یعنی چاہتے ہوئے یا نہ چاہتے ہوئے (willingly or unwillingly)۔

دنیا میں حالتِ فطری کے قائم ہونے سے موجودہ زمانے میں جو نئے مواقع کھلے ہیں، وہ سارے انسانوں کے لیے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اِن مواقع پر کسی ایک گروہ کی اجارہ داری (monopoly) قائم ہو جائے۔ خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق، آزادی (freedom) ہر انسان کا فطری حق ہے، مومن کا بھی اور غیر مومن کا بھی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ آزادی صرف اہلِ ایمان کو حاصل ہو اور دوسرے لوگوں کے لیے وہ منسوخ قرار پائے۔ دوسرے لوگ بھی اپنی آزادی کو کھلے طور پر استعمال کریں گے۔ اگر کسی کے استعمالِ آزادی سے اہلِ ایمان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں تو یہ اہلِ ایمان کا اپنا مسئلہ ہے، وہ دوسروں کا مسئلہ نہیں۔ دوسروں پر صرف یہ پابندی لگائی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی آزادی کو اِس طرح استعمال نہ کریں کہ وہ دوسروں کے لیے جسمانی جراحت (physical injury) کا سبب بن جائے۔ اِس ایک پابندی کے سوا، کوئی اور پابندی نہ مطلوب ہے اور نہ ممکن۔

## خلاصہ کلام

ایک اسلامی اسکالر کا مقالہ نظر سے گزرا۔ اِس مقالے میں انھوں نے لکھا تھا کہ اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ بنیادی طور پر دو ہے — توحید اور عدل۔ توحید (Monotheism) سے مراد ان کے نزدیک انفرادی عقیدہ تھا، اور عدل (justice) سے مراد عدل پر مبنی اجتماعی نظام۔ انھیں دو تصورات کے تحت انھوں نے پورے اسلام کی تشریح کی تھی۔

مگر میرے مطالعہ کے مطابق، اسلام کا یہ تصور درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید اور عدل دونوں ہی انفرادی نوعیت کے احکام ہیں۔ توحید سے مراد ہے ایک انسان کا انفرادی عقیدہ، اور

عدل سے مراد ہے، ایک انسان کا انفرادی سلوک۔ قرآن کے مطابق، اللہ تعالی نے انسان کو معرفت کے لیے پیدا کیا ہے (51:56)۔ انسان کو اللہ تعالی نے عقل دی۔ اب انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ عقل کو استعمال کر کے اپنے خالق کو دریافت کرے۔ یہی دریافت، خدا پرستانہ زندگی کا آغاز ہے۔ اِس دریافت کا تعلق انسان کی پوری زندگی سے ہے۔ جب کسی شخص کو حقیقی معنوں میں یہ دریافت ہوتی ہے تو اس کے بعد فطری طور پر اس کی پوری زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوجاتا ہے۔ اس کی پوری شخصیت ایک نئی شخصیت بن جاتی ہے، وہ پورے معنوں میں ایک ربانی انسان بن جاتا ہے۔

اسی قسم کا ربانی انسان تخلیق کا اصل مقصود ہے۔ اِسی قسم کے ربانی افراد، نہ کہ ربانی معاشرہ، خدا کے تخلیقی منصوبے کا اصل مقصود ہیں۔ موجودہ دنیا میں ایسے افراد پوری انسانی تاریخ سے منتخب کیے جائیں گے اور پھر اِن منتخب افراد کی بنیاد پر آخرت کی دنیا میں ایک اعلی ربانی معاشرہ وجود میں آئے گا۔ یہی وہ افراد ہیں جو خدا کی ابدی جنتوں میں جگہ پائیں گے۔

خالق نے اِس دنیا میں انسان کو کامل آزادی دی ہے۔ یہ آزادی برائے امتحان ہے، نہ کہ برائے استحقاق۔ انسان کو یہ آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرے۔ یہ آزادی قیامت سے پہلے منسوخ ہونے والی نہیں۔ اِس آزادی کی بنا پر ایسا ہے کہ اِس دنیا میں اعلی افراد تو بنتے ہیں، لیکن اعلی معاشرہ یا اعلی نوعیت کا اجتماعی نظام کبھی نہیں بنتا۔ انسانی زندگی کی یہ نوعیت قیامت تک بدستور باقی رہے گی۔ قیامت کے بعد ایک نئی کامل دنیا بنے گی۔ وہاں پوری تاریخ کے منتخب افراد بسائے جائیں گے اور جو لوگ اپنی آزادی کا صحیح استعمال نہ کر سکے، اُن کو جمع کر کے کائناتی کوڑے خانے میں ڈال دیا جائے گا — خدا کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسانی زندگی کی حقیقت یہی ہے۔ انسانی زندگی کی بامعنی تعبیر صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ اِس خدائی منصوبے کو ذہن میں رکھ کر اس کی تعبیر کی جائے، انسانی تاریخ کو بامعنی تعبیر دینے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔ (25 اکتوبر 2012)

# ہدایت اور اظہارِ دین

قرآن کی سورہ الفتح کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا :

God is One Who has sent His Messenger with guidance and the true religion, so that God may have it prevail over all religions, God suffices as a witness. (48:28)

1- آیت کا اسلوب بتاتا ہے کہ اِس آیت میں جس واقعے کا ذکر ہے، وہ کوئی انسانی واقعہ نہیں، بلکہ وہ ایک حتمی فیصلہ ہے، یعنی اللہ نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ لازماً ایسا ہو- مزید یہ کہ قرآن کی یہ آیت اُس فیصلہ خداوندی کے بارے میں ہے جس کا تعلق خاتم النبیین سے ہے اور چوں کہ خاتم النبیین کی نبوت قیامت تک کے لیے ہے، اِس لیے اِس فیصلے کا انطباق بھی لازماً قیامت تک جاری رہے گا- اِس آیت میں پیغمبر یا امتِ مسلمہ کے مشن کو نہیں بتایا گیا ہے، بلکہ اس میں اللہ کے ایک فیصلے کو بتایا گیا ہے، جو پوری انسانی تاریخ میں لازماً ایک واقعہ بنے گا-

2- دوسری چیز ہدایت ہے- ہدایت سے مراد اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی الہامی ہدایت ہے- اِس الہامی ہدایت کے بارے میں اللہ کا یہ فیصلہ تھا کہ وہ ہر اعتبار سے محفوظ رہے، اس کا عربی متن، اس کی زبان، اس کا لہجہ، حتی کہ اس کا طرزِ کتابت، وغیرہ- قرآن ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اترا- اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کتاب (قرآن) ہر اعتبار سے محفوظ ہے- پرنٹنگ پریس اور ریکارڈنگ کا دور بتاتا ہے کہ اب قرآن کی یہ حفاظت مزید اضافے کے ساتھ یقینی بن چکی ہے-

3- اظہارِ دین سے مراد خود دین کا اظہار ہے، نہ کہ دین کے سوا کسی اور چیز کا اظہار- اِس آیت میں اظہارِ دین سے مراد سیاسی اقتدار یا اجتماعی نظام نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین بحیثیت دینِ حق اپنے نظریاتی غلبہ کو ہمیشہ برقرار رکھے گا- یہ غلبہ بہ اعتبار حجت (دلیل) ہوگا، نہ کہ بہ اعتبار نظام- دینِ حق کے نظریاتی غلبہ کو ہمیشہ برقرار رکھنا تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ ہے، کیوں کہ

اِس مقصد کو اِس طرح حاصل کرنا ہے کہ انسان کی آزادی پوری طرح برقرار رہے اور اِس کے ساتھ دین کا نظریاتی غلبہ بھی مسلسل طور پر قائم رہے۔ اِس نوعیت کا پیچیدہ منصوبہ کسی بھی انسان کے بس میں نہیں۔ اِس مقصد کے حصول کے لیے انسانی تاریخ کو اِس طرح مینیج (manage) کرنا ہے کہ تاریخ کا آزادانہ سفر بھی جاری رہے اور یہ مقصد بھی حسب منشا حاصل ہو جائے۔

اِس مقصد کے لیے اللہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب بھی کچھ لوگ بطور خود دینِ حق کا کوئی غلط ایڈیشن (false edition) تیار کریں تو اس کے بعد خود تاریخ میں ایسے اسباب پیدا ہوں جو اِس ایڈیشن کا خاتمہ کر دیں اور اِس طرح دینِ حق کی صداقت بدستور برقرار رہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت سے اب تک ایسے 3 بڑے واقعات پیش آئے ہیں، جب کہ انسان نے خود ساختہ طور پر دین کا ایک غلط ایڈیشن تیار کیا، لیکن اس کے بعد تاریخی عمل کے تحت ایسے حالات پیدا ہوئے جنھوں نے مذہب کے اِس غلط متبادل (wrong alternative) کو حجت (دلیل) کی سطح پر ختم کر دیا۔ اِس طرح دین حق کی نظریاتی صداقت بدستور تاریخ میں قائم رہی۔

تاریخ میں اِس نوعیت کی پہلی مثال مظاہر فطرت کی پرستش (nature worship) ہے جس کو مذہب کی زبان میں شرک کہا جاتا ہے۔ فطرت کی پرستش کا مطلب یہ ہے کہ فطرت کے مظاہر، سورج، چاند ستارے، وغیرہ میں خدائی صفات (divine attributes) کو فرض کر کے ان کی پرستش کرنا۔ مظاہر فطرت کی یہ پرستش قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک قائم رہی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ تعالی نے تاریخ میں ایسا انقلابی عمل جاری کیا جس کے نتیجے میں آخر کار وہ دور آیا جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے۔ جدید سائنس کے ذریعے مظاہر فطرت کی موضوعی تحقیق (objective exploration) کی گئی۔ اِس کے نتیجے میں علمی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ فطرت میں کوئی اُلوہیت (divinity) نہیں ہے۔ اِس طرح انسان کے خود اپنی عقلی مسلّمہ پر یہ ثابت ہو گیا کہ فطرت صرف مخلوق ہے، اس کے اندر کوئی بھی الوہی صفت (divine attribute) نہیں۔ اِس طرح، خدا کے دین کا دینِ حق ہونا بدستور ثابت شدہ بنا رہا۔

قدیم تاریخ میں دین حق کا دوسرا غلط متبادل (false alternative) شخصیت پرستی (personality cult) کی صورت میں پیدا ہوا۔ شخصیت پرستی کا سیاسی اظہار بادشاہت کے ادارہ کی صورت میں ہوا۔ بادشاہ کے متعلق مان لیا گیا کہ وہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں، پراسرار فوقیت رکھتا ہے۔ اِس طرح بادشاہ کو عملاً وہ درجہ دے دیا گیا جو معبود کا درجہ ہونا چاہیے۔ یہ بادشاہت یا سیاسی شخصیت پرستی انسانی تاریخ میں کئی ہزار سال تک جاری رہی۔ بادشاہت کے دور میں انسانی سوچ کا مرکز ومحور بادشاہ بن گیا۔ اعلیٰ انسانی جذبات بادشاہ کے ساتھ وابستہ کردئے گئے۔ عام طور پر یہ مان لیا گیا کہ — جو بادشاہ کا مذہب، وہی سب کا مذہب (الناس علی دین ملوکھم)

بادشاہت کے پورے زمانے میں ساری دنیا میں زراعت کا دور قائم تھا۔ اُس زمانے میں زراعت (agriculture) اقتصادیات کا واحد ذریعہ تھی۔ اُس زمانے میں زمین کا مالک ہونے کی بنا پر بادشاہ اقتصادیات کا واحد مالک بنا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں بادشاہ کو یہ حیثیت تھی کہ بادشاہ دینے والا ہے اور بادشاہ چھیننے والا۔ اُس زمانے میں بادشاہ کو عملاً وہ درجہ ملا ہوا تھا، جو درجہ خدا کا ہونا چاہیے۔ اِن حالات میں یہ تصور پیدا ہوا کہ بادشاہ حاکم (ruler) ہے اور دوسرے تمام لوگ محکوم (ruled) کی حیثیت رکھتے تھے۔ قدیم زمانے کی اِس نفسیات کو ایک فارسی شاعر نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

اِس طرح بادشاہ گویا خدا کا ایک سیاسی متبادل (political alternative) بن گیا تھا۔ گویا دین باطل نے دین حق کی جگہ لے رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو یہ صورتِ حال مطلوب نہ تھی، چناں چہ تاریخ میں ایک نیا عمل (process) جاری ہوا۔ یہ عمل ساتویں صدی عیسوی میں شروع ہوا، جب کہ عرب میں قبائلی سرداری کا نظام رائج تھا اور عرب کے اطراف میں دو بڑے ایمپائر قائم تھے — ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر۔ بائبل کے الفاظ میں، یہ گویا سیاسی چٹانیں تھیں۔ رسول اور اصحابِ رسول کے ذریعے اِن سیاسی چٹانوں کو توڑ کر تاریخ میں ایک نیا سیاسی عمل جاری ہوا۔ یہ عمل سفر کرتے ہوئے آخر کار یورپ پہنچا۔ اِس سیاسی عمل کا نقطۂ انتہا 1789 میں پیش آنے والا فرانسیسی انقلاب تھا۔

اِس انقلاب کے بعد دنیا میں ایک نیا دور آیا جس کو جمہوریت کہا جاتا ہے۔ جمہوریت نے شخصی بادشاہت کے تصور کا خاتمہ کر دیا اور دنیا میں عوامی حکومت کا دور آیا، جس کا فارمولا یہ تھا:

Government of the people, by the people, for the people.

اِس جمہوری انقلاب نے قدیم طرز کی شخصی بادشاہت (monarchy) کا خاتمہ کر دیا، پہلے یورپ میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں۔ اِس طرح دنیا میں بادشاہی مذہب کا خاتمہ ہو گیا اور نظری طور پر دین حق دوبارہ دنیا میں قائم ہو گیا۔ دین حق کا یہ قیام سیاسی اقتدار یا حکومتی نظام کے معنی میں نہ تھا، بلکہ وہ حجت کی سطح پر دین حق کا فکری اظہار تھا۔ یہ واقعہ اتفاقاً پیش نہیں آیا، بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ تاریخ میں ایک عظیم خدائی آپریشن کا نتیجہ تھا۔ جمہوریت صرف ایک سیاسی نظریہ نہ تھا، اس کا ایک اور اہم تر پہلو یہ تھا کہ اس نے اُس سیاسی الوہیت (political divinity) کے تصور کا خاتمہ کر دیا جس کو بنیاد بنا کر قدیم زمانے کے بادشاہ اپنی عظمت قائم کیے ہوئے تھے۔ جمہوری انقلاب کے بعد سیاسی اقتدار صرف ایک انتظامیہ (administration) بن کر رہ گیا، ایک مقدس ادارے کی حیثیت سے اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اِس سلسلے کی تیسری مثال وہ ہے جس کو ہیومن ازم (Humanism) کہا جاتا ہے۔ ہیومن ازم ایک جدید فلسفہ ہے جس کو دوسرے الفاظ میں، انسان پرستی کہا جا سکتا ہے۔ یہ دین حق کا آخری غلط متبادل ہے جو بیسویں صدی کے نصف آخر میں زیادہ طاقت کے ساتھ پیدا ہوا۔ یہی معاملہ وجودیت (Existentialism) کا ہے، جس کا بانی فرانسیسی فلسفی سارتر ے (Jean Paul Sartre) ہے جس کی وفات 1946 میں ہوئی۔ وجودیت بھی دراصل ہیومن ازم کا فلسفیانہ ایڈیشن ہے۔

ہیومن ازم کیا ہے، ہیومن ازم ایک غیر خدا پرستانہ فلسفہ ہے۔ ہیومن ازم ایک فکری نظام ہے جس کا مقصد ساری اہمیت انسان کو دینا ہے، نہ کہ خدا یا کسی فوق الفطری طاقت کو:

Humanism: An outlook or system of thought attaching prime importance to human, rather than divine or supernatural matters.

دورِ جدید کے بہت سے فلسفی ہیومن ازم کے نقطہ نظر کے حامی بن گئے۔ مثلاً جرمن فلسفی

لدوگ فیوربا خ (Ludwig Feverbach) جس کی وفات 1872 میں ہوئی، اس نے لکھا ہے کہ — انسان ہی خدا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور خدا نہیں:

God is nothing other than man himself.

امریکی فلسفی ولیم جیمس (William James) جس کی وفات 1910 میں ہوئی، وہ بھی ہیومن ازم کا حامی تھا، انگلش فلسفی جولین ہکسلے (Julian Huxley) جس کی وفات 1975 میں ہوئی، اس نے ہیومن ازم کی حمایت میں ایک کتاب لکھی۔ اس کا ٹائٹل یہ ہے:

*Religion Without Revelation*

اِس کتاب میں ہیومن ازم کی تعریف اِس طرح کی گئی ہے — سیٹ کا خدا سے انسان کی طرف منتقل ہوجانا (Transfer of seat from God to Man.)۔

ہیومن ازم کے موضوع پر عام قاری کے لیے ایک قابلِ مطالعہ کتاب یہ ہے:

*Humanism: A Very Short Introduction,* by Stephen Law, 2011

بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہیومن ازم کے فلسفے کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ لوگوں نے یہ فرض کرلیا کہ انھیں دین خداوندی کا ایک بدل مل گیا ہے۔ غیر خدا پرست طبقے میں یہ سمجھا جانے لگا کہ — انسان ہی ہر اعتبار سے سب کچھ ہے (Man is the measure of all things.)

مگر عین اِسی زمانے میں ایک نیا طاقت ور ظاہرہ پیدا ہوا جس نے ہیومن ازم کے تصور کو عملاً باطل ثابت کردیا۔ یہ طاقت ور ظاہرہ وہ تھا جس کو عام طور پر گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے، یعنی عالمی سطح پر حرارت کا غیر متناسب طور پر بڑھ جانا جس کے نتیجے میں زمین پر زندگی کا نظام درہم برہم ہوجائے۔

موجودہ زمانے میں جدید ٹکنالوجی کے ظہور کے بعد انڈسٹری کو بہت ترقی ہوئی۔ مختلف ملکوں میں کثیر تعداد میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے۔ اِن کارخانوں کو چلانے کے لیے جو ایندھن (fuel) استعمال ہوتا تھا، اُس سے مسلسل طور پر بڑی مقدار میں کاربن خارج ہونے لگا۔ اِس اخراج کو کاربن ایمیشن (carbon emission) کہا جاتا ہے۔ اِس کاربن ایمیشن نے زمین کے اوپر قائم شدہ فضا کو خطرناک حد تک آلودہ بنادیا۔

اِس فضائی آلودگی یا فضائی حرارت کے نتیجے میں کئی ناقابلِ حل مسائل پیدا ہو گئے۔ اِس کے نتیجے میں برف کے بڑے بڑے ذخائر، پہاڑوں کے گلیشیر، نارتھ پول اور ساؤتھ پول کی آئس کیپ (ice cap)، سمندروں میں تیرتے ہوئے برفانی پہاڑ (iceberg) تیزی سے پگھلنے لگے۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ سمندروں کی سطح بڑھنے لگی۔ نازک حیوانات (fragile animals) مرنے لگے۔ اِس طرح کے واقعات کے نتیجے میں یہ ہوا کہ زمین پر قائم شدہ لائف سپورٹ سسٹم تباہ ہونے لگا، حتی کہ اب سائنس داں یہ خبر دے رہے ہیں کہ زمین بہت جلد انسان کے لیے ناقابلِ رہائش بن جائے گی۔

اِس صورتِ حال کا پیدا ہونا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ دراصل ہیومن ازم کے فلسفے کی موت کا اعلان ہے۔ ہیومن ازم کے فلسفے میں یہ مان لیا گیا تھا کہ انسان کائنات میں مرکزی مقام (central position) رکھتا ہے۔ انسان کی اِس حیثیت کو ماننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ مانا جائے کہ انسان کو ہر طرح کی قدرت حاصل ہے، انسان اپنے مستقبل کا مالک ہے۔ اگر انسان واقعۃً اِس طرح کی طاقت رکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ وہ موجودہ زمانے میں زمین پر واقع ہونے والی اُس انسان کُش تباہی کو روکے جو گلوبل وارمنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ گلوبل وارمنگ کو روکنے میں انسان کی ناکامی نے ہیومن ازم کے فلسفے کا آخری طور پر خاتمہ کر دیا ہے۔

جب گلوبل وارمنگ کا ظاہرہ سامنے آیا تو تمام دنیا کی حکومتیں اور تمام دنیا کے سائنس داں بڑے پیمانے پر متحرک ہو گئے۔ کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں اِس موضوع پر ہونے والی کانفرنس (دسمبر 2009) میں دنیا کے تمام ملکوں کے سائنس داں بڑی تعداد میں اکٹھا ہوئے۔ اِس طرح کی کوششیں حکومتوں کی طرف سے بھی کی جارہی ہیں اور سائنس دانوں کی طرف سے بھی۔ اِس موضوع پر تحقیقات اور تجربات کا سلسلہ ساری دنیا میں مسلسل طور پر جاری ہے، مگر نتیجے کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ناکام ثابت ہوا۔ گلوبل وارمنگ کا خطرہ مسلسل طور پر بڑھ رہا ہے۔ اب وہ خطرناک سطح تک پہنچ چکا ہے، مگر اُس کو روکنے کے لیے انسان کی ہر کوشش پوری طرح بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہے۔

گلوبل وارمنگ کا یہ تجربہ کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ وہ ہیومن ازم کے نظریے کے کامل ابطال

(total negation) کے ہم معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گلوبل وارمنگ کے ظاہرے نے اُسی طرح ہیومن ازم کے فکر کا خاتمہ کر دیا ہے جس طرح اس سے پہلے فطرت پرستی کو سائنس نے ختم کیا تھا اور جمہوریت کے ذریعے بادشاہت کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔

موجودہ گلوبل وارمنگ بھی پچھلے خدائی آپریشن کی طرح ایک خدائی آپریشن ہے جس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دینِ حق کے لیے ہیومن ازم کا متبادل ایک بے بنیاد متبادل (false alternative) تھا۔ اِس طرح خدائی فیصلے کے مطابق، دین حق نے دوبارہ تاریخ میں فکری اظہار کا وہ درجہ حاصل کر لیا جو خدا نے اس کے لیے ابدی طور پر مقدر کیا تھا۔

## خلاصہ کلام

اوپر جو کچھ کہا گیا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے ساتویں صدی کے ربع اول میں یہ اعلان کیا تھا کہ خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت ہی مستند ہدایت (authentic guidance) ہے اور خدا کا دین ہی دینِ حق ہے۔ خدا نے یہ مقدر کر دیا تھا کہ خدا کی نازل کردہ ہدایت (قرآن) ابدی طور پر پوری طرح محفوظ رہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ہدایت کے بارے میں خدا کا فیصلہ کامل طور پر پورا ہوا۔

اِس سلسلے میں دوسری چیز خدا کا نازل کردہ دین ہے۔ خدا کی نظر میں یہی دین ہمیشہ کے لیے دین حق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس دین کے بارے میں خدا کا یہ فیصلہ تھا کہ جب بھی انسان بطور خود اس کا کوئی غلط متبادل تیار کرے تو خود تاریخ میں ایسے اسباب پیدا ہوں جو مسلّمہ دلائل کی سطح پر اس کو غیر معتبر ثابت کر دیں۔ خدا کے اِس فیصلے کا اظہار بھی تاریخ میں بار بار ہوتا رہا اور اب اکیسویں صدی میں جو صورتِ حال ہے، وہ یہ ہے کہ ہدایت اور دینِ حق دونوں کے معاملے میں انسان کے پاس کوئی دوسرا انتخاب باقی نہیں۔ اب حقیقت کے اعتبار سے، انسان کے لیے ایک ہی ممکن انتخاب ہے اور وہ وہی ہے جو خدا نے خاتم النبیین کی بعثت کے وقت اس کے لیے مقدر کر دیا تھا۔ (20 نومبر 2012)

# دعوہ ایکٹوزم

## From Political Activism to Dawah Activism

مشہور محدث امام مالک بن انس (وفات: 179 ہجری) کا ایک قول اِن الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: لا یصلح آخر هذه الأمة، إلا بما صلح به أولها (مسند الموطأ، رقم الحدیث: 783) یعنی اِس امت کے دورِ آخر کے لوگوں کی اصلاح بھی اُسی طرح ہوگی، جس طرح اِس امت کے دورِ اول کے لوگوں کی اصلاح ہوئی تھی۔

امت کے لیے یہ طریقہ اصلاح کیا ہے، اس کا اندازہ رسول اور اصحابِ رسول کے دور کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ رسول اور اصحابِ رسول کے دور کو اسلام کا دورِ اول کہا جاسکتا ہے۔ اِس دور میں جو کچھ پیش آیا، اس کی تفصیل حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ اِس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنے مشن کا آغاز کیا۔ 13 سال تک آپ پُرامن انداز میں اپنے مشن کو چلاتے رہے۔ اِس مدت میں مکہ کے کچھ افراد نے اسلام قبول کیا، لیکن وہاں کی بڑی اکثریت آپ کی مخالف بن گئی۔ انھوں نے ہر صورت سے آپ کو ستانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ رسول اور اصحابِ رسول یا تو مکہ سے ہجرت کر جائیں یا اہلِ مکہ کی طرف سے جارحانہ کارروائی کا سامنا کریں۔

اُس وقت حضرت عمر فاروق اور دوسرے اصحاب نے کہا کہ اگر ہم سے جنگ کی جاتی ہے تو ہم جنگ کریں گے۔ پیغمبر اسلام نے حضرت عمر فاروق کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: یا عمر، إنا قلیل (سیرت ابن کثیر: 1/441) یعنی اے عمر، ہم تھوڑے ہیں۔ پیغمبر اسلام کا یہ جواب کوئی سادہ جواب نہ تھا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی فریقِ ثانی کے ساتھ ٹکراؤ کا وقت نہیں آیا۔ اللہ کے منصوبے کے مطابق، یہ ایک قبل از وقت بات ہوگی کہ ہم فریقِ ثانی سے لڑ جائیں۔ ابھی ہمیں صبر کرتے ہوئے حالات کو اُس نوبت تک پہنچانا ہے جہاں اللہ اُس کو پہنچانا چاہتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے اِس معاملے میں جو ماڈل (model) قائم ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ پیغمبرانہ مشن کے دو بڑے حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان دعوت ہے، اور دوسرے حصے کا عنوان نصرت، یعنی اہلِ ایمان کو یہ کرنا ہے کہ پہلے وہ احساسِ ذمے داری کے تحت، دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں۔ وہ آخری حد تک پرامن رہتے ہوئے اپنے دعوتی مشن کو جاری رکھیں۔ وہ کسی حال میں ردعمل یا ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اِس کے بعد اہلِ ایمان کے ساتھ جو کچھ ہوگا، وہ تمام تر اللہ کی نصرت کے تحت ہوگا۔ اللہ کی نصرت کے تحت اہلِ ایمان کے لیے مزید مواقع کھلتے چلے جائیں گے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ اِن مواقع کو پہچانیں اور دانش مندانہ طور پر ان کو استعمال کریں، یہاں تک کہ ان کا سفرِ دعوت اپنی آخری منزل تک پہنچ جائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو نمونہ قائم ہوا، اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس معاملے میں نصرتِ الٰہی کے ظہور کے تین مرحلے ہیں۔ وہ مرحلے حسب ذیل ہیں:

1۔ نصرت باعتبارِ حفاظت (*Nusrat* in terms of security)

2۔ نصرت باعتبارِ پراسس (*Nusrat* in terms of process)

3۔ نصرت باعتبارِ فتح (*Nusrat* in terms of victory)

4۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا تو اللہ تعالی کی طرف سے آپ کو یہ ہدایت دی گئی: يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ○ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ○ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ○ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ○ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ (74:1-7)۔ یہ قرآن کی سورہ المدثر کی ابتدائی آیتیں ہیں۔ یہ سورہ اگرچہ بالکل ابتدا میں نازل ہوئی، لیکن تلاوت کی ترتیب کے اعتبار سے وہ مصحف کے آخری حصے میں شامل ہے۔ اِن آیات میں پیغمبر اسلام کو جو ہدایت دی گئی، اس کا مطلب یہ تھا کہ تم پُر امن انداز میں دعوت الی اللہ کا کام کرتے رہو۔ مشن کے بقیہ مراحل کا تعلق تمام تر اللہ کی نصرت سے ہے۔ تم انتظار کی پالیسی پر قائم رہو اور جب اللہ کی نصرت ظاہر ہو تو تم اس کے مطابق، اُس کو استعمال کرو۔

## نصرت باعتبارِ حفاظت

جیسا کہ عرض کیا گیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے 610 عیسوی میں مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا۔ آپ نے یک طرفہ طور پر امن کی روش اختیار کرتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اُس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپ کے ساتھ مخالفت کا طریقہ اختیار کیا۔ جب حالات بہت زیادہ شدید ہو گئے، اُس وقت بھی آپ نے ٹکراؤ سے مکمل اعراض کیا۔ یہاں تک کہ نبوت کے 13 سال بعد آپ مکہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ نے اور آپ کے اصحاب نے ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہیں کیا، بلکہ اپنے مقامِ عمل (work place) کو بدل دیا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ ہجرت کے بعد بھی مکہ کے مشرک سردار خاموش نہیں ہوئے، بلکہ انھوں نے یک طرفہ طور پر مسلّح جارحیت کا طریقہ اختیار کیا۔ انھوں نے باقاعدہ جنگی تیاری کر کے مدینہ پر حملہ کر دیا۔ یہ واقعہ پیغمبر اسلام کی ہجرت کے 16 ماہ بعد پیش آیا۔ مدینہ سے تقریباً 80 میل دور بدر کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اِس جنگ کو تاریخ میں غزوہ بدر کہا جاتا ہے۔ یہ صرف یک روزہ جنگ تھی جو 17 رمضان 2 ہجری کو پیش آئی۔ اِس جنگ میں فریقِ مخالف کی طرف سے ایک ہزار مسلح افراد تھے جو پوری تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ دوسری طرف 313 کی تعداد میں اصحابِ رسول تھے، جو کم تر جنگی تیاری کے باوجود اپنے دفاع کے لیے بدر کے مقام پر پہنچے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم خود بنفسہ عملاً اِس جنگ میں شریک نہ تھے۔ البتہ آپ کے لیے میدانِ جنگ سے باہر وقتی طور پر ایک عریش (hut) بنایا گیا تھا۔ روایات میں آتا ہے کہ جب دونوں گروہوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ کا وقت آیا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گر پڑے۔ اُس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے: اللهم إنك إن تهلك هذه العصابة من أهل الإسلام فلا تعبد في الأرض أبدا (مسند أحمد: 1/112) یعنی اے اللہ، اگر تو اِس گروہ کو ہلاک کر دے تو اِس کے بعد زمین پر کبھی تیری عبادت نہ ہوگی۔

اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام کی دعا قبول فرمائی اور قرآن (3:124-125) کے بیان کے

مطابق، میدانِ جنگ میں کئی ہزار کی تعداد میں فرشتے بھیجے۔ اِس کے بعد جو واقعہ پیش آیا، اُس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللهُ بِبَدْرٍ وَّأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ (3:123)

یہ معاملہ جو غزوہ بدر کے وقت پیش آیا، وہ کوئی سادہ معاملہ نہ تھا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو ہم نے نصرت باعتبار حفاظت سے تعبیر کیا ہے، یعنی منصوبۂ الٰہی کی تکمیل سے پہلے مخالفین نے یک طرفہ حملہ کر کے یہ کوشش کی کہ اصحابِ رسول کا خاتمہ کر دیا جائے، مگر یہ قبل از وقت تھا۔ ابھی وہ وقت آنے والا تھا جب کہ اصحابِ رسول کی جماعت اپنا آخری دعوتی رول ادا کرے۔ اِس کے لیے ضروری تھا کہ اِس جماعت کو مخالفین کے حملے سے بچا کر محفوظ رکھا جائے۔

اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے جب مکہ میں اپنا دعوتی مشن شروع کیا، اُسی وقت سے اللہ تعالی کا ایک منصوبہ زیر عمل آ گیا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ ایک مدت تک مختلف واقعات کے دوران پیغمبر اسلام اور آپ کی دعوتِ توحید کا خوب چرچا ہو، تاکہ مکہ اور اطرافِ مکہ کے لوگ اُس سے باخبر ہو جائیں۔ لوگوں کے اندر بڑے پیمانے پر اِس بارے میں تجسس (curiosity) پیدا ہو جائے اور پھر اُن کے اِس تجسس کو استعمال کر کے یہ موقع فراہم کیا جائے کہ لوگ بڑے پیمانے پر آپ کے مشن کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

## نصرت باعتبارِ پراسس

پراسس کے اِس معاملے کو قرآن میں رفعِ ذکر (94:4) کہا گیا ہے، یعنی لوگوں کے درمیان توحید کے مشن کا چرچا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں اپنی دعوتی مشن کا آغاز کیا تو ہر دن نئے نئے واقعات پیش آتے رہے — کبھی آپ، لوگوں کے مجمع میں جا کر اُن کو قرآن سنا رہے ہیں، کبھی مکہ کے کسی آدمی کے قبولِ اسلام پر مخالفین کی طرف سے اس پر تشدد کیا جا رہا ہے، کبھی کسی مسلمان کو حرمِ مکہ میں نماز پڑھنے سے روکا جا رہا ہے، کبھی باہر سے مکہ آنے والا کوئی شخص پیغمبر اسلام سے اِس معاملے میں سوال و جواب کر رہا ہے، کبھی حج کا موسم ہے اور مختلف قبائل کے لوگ مکہ آ رہے ہیں اور آپ وہاں جا کر اُن کے سامنے اپنے مشن کا تعارف پیش کر رہے ہیں، کبھی آپ کا اور آپ کے خاندان کا بائکاٹ کیا جا رہا ہے، کبھی مکہ کے سرداروں کی ایذا رسانی سے مجبور ہو کر اصحابِ رسول کا ایک قافلہ مکہ سے ہجرت کر کے حبش جا رہا ہے، کبھی آپ

اپنے مشن کے تحت طائف اور دوسرے مقامات پر جاتے ہیں، کبھی دار الندوہ میں پیغمبر اسلام کے خلاف مشورہ ہو رہا ہے اور آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے، وغیرہ۔

پھر جب مکہ میں 13 سال قیام کے بعد آپ مکہ سے 300 میل کی دوری پر واقع شہر مدینہ چلے جاتے ہیں تو اِس تذکرے میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب غزوات اور سرایا اور جھڑپوں (skirmishes) جیسے واقعات کے نتیجے میں آپ کا اور آپ کے مشن کا چرچا تمام عرب میں، حتی کہ اطرافِ عرب میں پھیل جاتا ہے۔ آپ کے مخالفین کی مخالفانہ کارروائیوں کے نتیجے میں بظاہر بہت سے واقعات ہو رہے تھے جو مسلسل لوگوں کے علم میں آ رہے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک بلا اعلان عمل جاری تھا۔ یہ عمل اِن واقعات کے درمیان ایک انڈر کرنٹ یا زیر سطح عمل (underneath the surface process) کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کے اندر نہایت تیزی سے تجسس کی نفسیات پیدا کر رہا تھا۔ لوگ فطری طور پر جاننا چاہتے تھے کہ یہ مشن کیا ہے اور اِس مشن سے وابستہ افراد کا معاملہ کیا ہے۔ تجسس کی یہ زیریں رو اللہ کے منصوبے کے مطابق، عین مطلوب تھی، کیوں کہ اُس سے پیغمبر اسلام کے مشن کے دعوتی مواقع مسلسل طور پر بڑھ رہے تھے۔ یہی وہ عمل ہے جس کو ہم نے نصرت باعتبار پراسس کا نام دیا ہے۔

## نصرت باعتبارِ فتح

ہجرت کے دوسرے سال اِس انڈر کرنٹ عمل پر تقریباً 20 سال گزر چکے تھے۔ نصرت باعتبار پراسس کا عمل اپنی تکمیل کے مرحلے تک پہنچ گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ اِس پیدا شدہ امکان کو بھرپور طور پر دعوت کے لیے استعمال (avail) کیا جائے۔ مگر مخالف فریق نے جنگ اور ٹکراؤ کا جو ماحول بنا رکھا تھا، اس کی موجودگی کی بنا پر اِس پیدا شدہ موقع کو استعمال کرنا عملاً ناممکن ہو گیا تھا۔ اِس لیے اب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حکمت کے ساتھ ایک نیا منصوبہ بنایا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت مدینہ میں تھے۔ اللہ تعالی نے آپ کو خواب دکھایا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ جا رہے ہیں۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب کو بتایا۔ اِس کو سن کر لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ عمرہ کے لیے مکہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔ اِس کے مطابق،

آپ یکم ذی القعدہ 6 ہجری کو عمرہ کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اُس وقت تقریباً 15 سو مہاجرین اور انصار آپ کے ساتھ تھے۔ اہلِ مکہ کو پیغمبر اسلام کے اِس سفر کی اطلاع ہوگئی۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ کسی قیمت پر پیغمبر اسلام کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ چناں چہ انھوں نے آگے بڑھ کر حدیبیہ کے مقام پر آپ کے قافلے کو روک دیا جو کہ مکہ سے 9 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب نے حدیبیہ میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اِس کے بعد اہلِ مکہ کے نمائندے وہاں آنے لگے اور تقریباً دو ہفتے تک دونوں فریق کے درمیان گفت وشنید جاری رہی۔ اِس گفتگو کے دوران پیغمبر اسلام کو یہ موقع ملا کہ آپ اہلِ مکہ سے یہ کہیں کہ ہمارے اور تمھارے درمیان ٹکراؤ اور جنگ کی جو صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے، وہ ایک غیر مطلوب چیز ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس کو ختم کر دیا جائے۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ فریقین کے درمیان صلح کا معاہدہ (peace treaty) ہو جائے۔

صلح کا یہ معاہدہ جب کاغذ پر لکھا جانے لگا تو اہلِ مکہ کے نمائندہ سردار نے شدید انداز میں حمیتِ جاہلیہ (48:26) کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ضد اور سرکشی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ان کی یک طرفہ شرطوں کی بنیاد پر معاہدہ کیا جائے، حتی کہ انھوں نے اصرار کیا کہ "رسول اللہ" کے لفظ کو معاہدے کی تحریر سے مٹا دیا جائے۔ پیغمبر اسلام نے اہلِ مکہ کی تمام شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان لیا، صرف اِس لیے کہ اِس معاہدے کے ذریعے دونوں فریق کے درمیان امن کا ماحول قائم ہو رہا تھا۔

حدیبیہ کا معاہدۂ صلح اہلِ مکہ کی یک طرفہ شرطوں کی بنیاد پر ہوا تھا۔ چناں چہ صحابہ کے اندر اس کے خلاف شدید ردعمل پیدا ہوا۔ عمر فاروق نے کہا: لما نعطي الدنية من ديننا (صحيح البخاري، رقم الحديث: 2731) یعنی ہم اپنے دین کے معاملے میں اِس ذلت آمیز معاہدے کو کیوں قبول کریں۔ ایک صحابی نے رسول اللہ سے کہا کہ آپ نے مدینہ میں اپنے ایک خواب کے حوالے سے ہم کو بتایا تھا کہ ہم عمرہ کرنے مکہ جا رہے ہیں، پھر یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ عمرہ کے بغیر درمیان سے لوٹ رہے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا میں نے یہ کہا تھا کہ ہم اِسی سال مکہ جا کر عمرہ کریں گے (أفأخبرتك أنا نأتيه العام؟)۔ اِن تمام مخالفتوں کے باوجود آپ نے اہلِ مکہ سے

امن کا معاہدہ کرلیا اور حدیبیہ سے مدینہ کے لیے واپسی کا فیصلہ فرمالیا۔

معاہدہ حدیبیہ کی تکمیل کے فوراً بعد وہ سورہ اتری جو قرآن میں الفتح کے نام سے شامل ہے۔ اِس سورہ کا آغاز اِن الفاظ سے ہوتا ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا (48:1) یعنی ہم نے تم کو کھلی فتح دے دی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سورہ اپنے اصحاب کو پڑھ کر سنائی تو ابتداءً صحابہ کو یہ بیان بہت عجیب معلوم ہوا۔ عمر فاروق نے کہا: أو فتح هو يا رسول الله - قال: نعم، والذي نفسي بيده إنه لفتح (القرطبي 16/261) یعنی اے خدا کے رسول، کیا یہ کوئی فتح ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ ہاں، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یقیناً وہ فتح ہے۔ اِسی طرح ایک اور صحابی نے کہا: ما هذا بفتح - فقال: بل هو أعظم الفتوح - (القرطبي 16/260) یعنی یہ تو کوئی فتح نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں وہ فتح ہے، بلکہ سب سے بڑی فتح ہے۔

معاہدہ حدیبیہ دراصل ایک تدبیر تھی۔ اُس نے عمل کے میدان کو بدل دیا۔ اِس سے پہلے اہلِ ایمان مجبور تھے کہ وہ ٹکراؤ اور جنگ کے میدان میں فریقِ ثانی سے مقابلہ کریں، لیکن اب اُن کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ اپنی پوری قوت کو یکسوئی کے ساتھ دعوت کے میدان میں استعمال کریں۔ میدانِ عمل کی یہ تبدیلی بے حد اہم تھی۔ اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ صرف دو سال کے محدود عرصے میں اسلام پورے جزیرہ عرب میں پھیل گیا۔

اِس نتیجے کو دیکھتے ہوئے مشہور تابعی ابن شہاب الزہری (وفات: 124 ہجری) نے کہا تھا کہ: لقد كان الحديبية أعظم الفتوح (القرطبي، 16/261) یعنی حدیبیہ اسلام میں سب سے بڑی فتح تھی۔ مگر یہ سادہ طور پر صرف نتیجے کی بات نہیں، بلکہ وہ منصوبہ (planning) کی بات تھی۔ یہ کوئی اتفاقی نتیجہ نہ تھا، بلکہ وہ ایک گہری منصوبہ بندی کے ذریعے پیش آنے والا منصوبہ تھا۔ یہی وہ چیز ہے جس کو ہم نے نصرت باعتبار فتح کا عنوان دیا ہے۔

یہ معاملہ دراصل نصرت بذریعہ پراسس کا معاملہ تھا۔ حدیبیہ سے پہلے تقریباً 20 سال تک بظاہر ٹکراؤ اور مخالفت کے جو واقعات پیش آرہے تھے، اُن کے ساتھ فطری طور پر ایک زیر سطح پراسس

جاری تھا۔ اِس پر اسس کو ایک لفظ میں، منفی تعارف کہا جاسکتا ہے۔ اِس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر ایک کے لیے اسلام ایک ایسی حقیقت بن گیا جو یہ تقاضا کر رہا تھا کہ اُس کو براہِ راست جاننے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں، اِس صورتِ حال نے بڑے پیمانے پر اسلام کے لیے دعوت کے مواقع پیدا کر دئے، جیسا کہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے۔

معاہدہ حدیبیہ کا معاملہ بلاشبہہ ایک حکیمانہ منصوبہ بندی کا معاملہ تھا۔ یہ حکیمانہ منصوبہ بندی تمام تر فطرت کے قوانین پر مبنی ہے، اِس لیے ہر زمانے میں دوبارہ اس کا کامیاب تجربہ کیا جاسکتا ہے، جس طرح دورِ اول میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا تھا ''نصرت باعتبار فتح'' کا معاملہ خصائص نبوی کا معاملہ نہیں، بلکہ وہ اسوہ نبوی کا معاملہ ہے۔ اس کو ہر زمانے میں اُسی طرح دہرایا جاسکتا ہے جس طرح پیغمبر کے دوسرے نمونوں کو دہرایا جاسکتا ہے۔

## حدیبیہ اور اسوہ رسول

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) یعنی اللہ کے رسول میں تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اِس آیت میں 'اسوہ' کسی محدود معنی میں نہیں ہے، وہ پیغمبر کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اپنی پوری زندگی کے اعتبار سے، اہلِ ایمان کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس عموم میں استثنا صرف کسی ایسی چیز کا ہوسکتا ہے جس کو صراحتاً پیغمبر کے ساتھ خاص کیا گیا ہو۔ مثلاً ازدواج کے معاملے میں بعض پہلوؤں سے آپ کے ساتھ استثنا کا معاملہ، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ (33:50)۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کا ہر قول اور ہر فعل امت کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ ہوگا، الا یہ کہ رسول کے کسی فعل کو صراحتاً رسول کی ذات کے ساتھ خاص کیا گیا ہو۔ اِس اصول کی روشنی میں معاہدۂ حدیبیہ کا معاملہ بلاشبہہ ایک قابلِ تقلید اسوہ رسول کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی اور جہاں بھی وہ حالات پیدا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ 6 ہجری میں پیدا ہوئے تھے، تو اُس وقت اسوہ حدیبیہ اُسی طرح امت کے لیے قابلِ اتباع بن جائے گا، جس طرح وہ دورِ اول کے اہلِ ایمان کے لیے قابلِ اتباع بنا تھا۔

معاہدہ حدیبیہ ایک فتح کا معاملہ تھا۔ فتح کا معاملہ صرف پیغمبر کے لیے خاص نہیں، وہ تمام امت کے لیے یکساں طور پر مطلوب ہے۔ قرآن میں بار بار فتح کو اہلِ ایمان کے لیے ایک عمومی مطلوب کی حیثیت سے بتایا گیا ہے۔ مثلاً: وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (61:13) جب فتح پوری امت کے لیے ایک مطلوب شے ہے تو فتح کی تدبیر بھی یقینی طور پر پوری امت کے لیے ایک مطلوب شے ہوگی۔ فتح اور تدبیرِ فتح کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں تدبیرِ فتح سے مراد سیاسی فتح (political victory) نہیں ہے، بلکہ نظریاتی فتح (ideological victory) ہے۔ موجودہ زمانے میں اِس نظریاتی فتح کا امکان پوری طرح پیدا ہو چکا ہے۔ مگر اِس نظریاتی فتح کو واقعہ بنانا صرف اُس وقت ممکن ہے جب کہ حکمتِ حدیبیہ کو سمجھا جائے اور آج کے حالات کے لحاظ سے اس کا استعمال کیا جائے۔

## حکمتِ حدیبیہ

حدیبیہ کے واقعے کو سیرت کی کتابوں میں غزوۃ الحدیبیہ کے عنوان کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حدیبیہ کا واقعہ دوسرے بہت سے غزوات میں سے ایک غزوہ تھا۔ حالاں کہ حدیبیہ کا واقعہ نہ غزوہ تھا اور نہ دوسرے واقعاتِ نبوی کی طرح صرف ایک واقعہ۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیبیہ کا واقعہ ایک اعلیٰ درجے کا منصوبہ تھا۔ حدیبیہ کے واقعے کو، معروف معنی میں، غزوہ کہنا بلاشبہہ اس کا کم تر اندازہ (underestimation) کرنے کے ہم معنی ہے۔

حکمتِ حدیبیہ دراصل ایک فطری قانون ہے۔ اِس قانون کا ذکر قرآن کی سورہ الفتح میں اِن الفاظ میں کیا گیا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا (48:27) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی۔ یہ قرآن کا ایک اسلوب ہے۔ اِس سے مراد اللہ کا علم غیب نہیں ہے، بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اُس وقت ایک صورتِ حال موجود تھی، لیکن اس کو جاننے کے لیے ربانی عقل درکار تھی، عام آدمی اُس کو سمجھ نہیں سکتا۔ عام آدمی ہمیشہ چیزوں کو فیس ویلو (face value) پر لیتا ہے، عام آدمی صرف اُس بات کو جان پاتا ہے جو سطح پر ہوتی ہے۔ لیکن ربانی عقل رکھنے والا انسان

اپنی بصیرت کے تحت اُس حقیقت کو جان لیتا ہے جو وہاں زیر سطح موجود ہوتی ہے۔

6 ہجری میں عرب کے اندر یہ صورتِ حال تھی کہ بظاہر لوگ پیغمبر کے مخالف بنے ہوئے تھے، لیکن داخلی نفسیات کے اعتبار سے، ہر ایک کے اندر سکنڈ تھاٹ (second thought) آچکا تھا، یعنی شعوری یا غیر شعوری طور پر مذہبِ توحید کے بارے میں دلوں کے اندر نرم گوشہ (soft corner) کا پیدا ہونا۔ اِس کی ایک علامتی مثال خالد بن الولید (وفات: 21 ہجری) کا واقعہ ہے۔ وہ فتحِ مکہ سے کچھ پہلے ایمان لائے۔ وہ اپنے اُس وقت کے احساس کو اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: قد شهدت هذا المواطن كلّها على محمد صلى الله عليه وسلم، فليس في مواطن أشهده إلا أنصرف وأنا أرى في نفسي أني موضع في غير شيء (حياة الصحابة، جلد 1، صفحہ 160)

خالد بن الولید کے اِن الفاظ کو اگر جنرلائز کیا جائے تو اُس وقت کے عربوں کی اکثریت کا احساس یہی ہو چکا تھا۔ اگرچہ خارجی سطح پر ٹکراؤ اور مخالفت کا ماحول نظر آتا تھا، لیکن داخلی نفسیات کے اعتبار سے بیش تر لوگ فقد صغت قلوبكما (66:4) کا نمونہ بن چکے تھے۔

یہ صورتِ حال تھی جس کو استعمال (avail) کرنے کے لیے ایک عملِ اعتدال (process of normalization) درکار تھا، کیوں کہ معتدل ماحول کے بغیر اِس امکان کو استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یک طرفہ بنیاد پر معاہدہ حدیبیہ کر کے یہی معتدل ماحول بنایا گیا۔ اور اس کے بعد فطری طور پر وہ نتیجہ برآمد ہوا جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللهِ أَفْوَاجًا (110:1-2)

## ظاہرِ دنیا، باطنِ دنیا

صلح حدیبیہ 6 ہجری میں ہوئی۔ اِس واقعے کو قرآن میں فتح مبین (48:1) کہا گیا ہے۔ جس حکمت (wisdom) کے تحت حدیبیہ کا معاہدہ کیا گیا، اُس کا ذکر قرآن میں اِن الفاظ میں آیا ہے: فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا (48:27) یعنی اللہ نے وہ بات جانی جو تم نے نہ جانی، پس اللہ نے اس سے پہلے ایک فتحِ قریب ٹھہرا دی۔

قرآن کی اِس آیت میں بظاہر دنیا کا اور آخرت کا ذکر ہے، مگر اِس آیت کا ایک توسیعی مفہوم (extended sense) بھی ہے، جس کا اشارہ آیت کے اِس لفظ میں ملتا ہے: يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (30:7)۔ گویا دنیا کا ایک ظاہر ہے اور ایک اس کا باطن ہے۔ مگر ظاہر بیں لوگ صرف اس کے ظاہر کو جانتے ہیں، وہ اس کے باطن سے بے خبر رہتے ہیں، یعنی اکثر لوگ چیزوں کو ان کے فیس ویلو (face-value) پر لیتے ہیں، حالات کے گہرے پہلوؤں تک ان کی نظر نہیں پہنچتی۔

یہ آیت قرآن میں صلح حدیبیہ کے سیاق میں اتری۔ اِس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے آیت پر غور کیجئے تو اس سے ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے، وہ یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سطح (surface) پر جو کچھ نظر آتا ہے، وہ صرف حالات کا ظاہری پہلو ہوتا ہے، اِس کے سوا ایک اور چیز ہوتی ہے جو انڈر کرنٹ (undercurrent) ہوتی ہے۔ جس آدمی کے اندر ربانی بصیرت ہو، وہ سطح سے گزر کر انڈر کرنٹ امکانات کو دیکھ لے گا۔ وہ سطح کی باتوں کو نظر انداز کرے گا اور جو چیز انڈر کرنٹ ہے، اس کو دریافت کر کے اس کے مطابق، اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے گا۔

یہ ایک حکمتِ حیات ہے، یعنی سطح کی باتوں کو نظر انداز کر کے انڈر کرنٹ جو حالات ہیں، ان کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کرنا۔ معاہدۂ حدیبیہ اِسی حکمت کی ایک پیغمبرانہ مثال ہے۔ یہ مثال پیروانِ رسول کے لیے ایک ابدی ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔ پیروانِ رسول کو چاہیے کہ وہ رسول اللہ کے اِس نمونے کو اپنے حالات پر منطبق کریں اور اُس عظیم کامیابی کے حصے دار بنیں جو اِس حکمت پر اللہ نے مقدر کی ہے۔

## اکیسویں صدی میں حدیبیہ منصوبہ

اکیسویں صدی میں دوبارہ وہی حالات زیادہ بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئے ہیں جو کہ پہلی صدی ہجری میں معاہدہ حدیبیہ کے وقت عرب میں پیدا ہوئے تھے۔ اکیسویں صدی میں دوبارہ پوری طرح وہ امکان پیدا ہو گیا ہے جب کہ معاہدہ حدیبیہ کی تاریخ کو عالمی سطح پر دہرایا جائے۔ اِس امکان کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی شرط دوبارہ وہی ہے جو دورِ اوّل میں پیش آئی، اور وہ ہے صابرانہ دانش مندی یا دانش مندانہ صبر۔

موجودہ زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ مغربی قومیں نئے ذرائع سے مسلح ہو کر پوری دنیا میں

پھیل گئیں۔ انھوں نے ہر جگہ اپنا دبدبہ قائم کر دیا۔ یہ واقعہ زیادہ بڑے پیمانے پر اٹھارھویں صدی عیسوی میں پیش آیا۔ اُس وقت کی دنیا میں مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں — برصغیر ہند میں مغل ایمپائر، ایشیا اور افریقہ کے بڑے رقبے میں ترک ایمپائر، وغیرہ۔ مغربی قوموں نے مسلمانوں کی اِن سلطنتوں کو مغلوب کر لیا اور ہر جگہ اپنا دبدبہ قائم کر لیا۔ اِس عمل کا نقطۂ آغاز متعین کرنا ہو تو وہ 1799 قرار پائے گا۔ اسی سال دو بڑے فیصلہ کُن واقعے ہوئے۔ ایک طرف، اِسی سال بحرِ متوسط (Mediterranean Sea) میں مغربی طاقتوں نے ترکوں کے عظیم بحری بیڑہ (naval fleet) پر حملہ کر کے اس کو مکمل طور پر تباہ کر دیا۔ اور دوسری طرف، اِسی سال برٹش فوج نے سلطان ٹیپو کی فوج کو کامل شکست دے دی۔ اِس کے بعد برٹش جنرل نے فاتحانہ جذبے کے ساتھ کہا تھا کہ — آج انڈیا ہمارا ہے (Today, India is ours!)۔

اِس کے بعد انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں مسلسل اِس طرح کے واقعات ہوتے رہے۔ مثلاً 1857 میں انڈیا میں مغل سلطنت کا خاتمہ، 1924 میں خلافتِ عثمانی کا خاتمہ، 1948 میں اسرائیل کا قیام، اور پھر دوسری عالمی جنگ (1939-1945) کے بعد نام نہاد امریکی امپیریل ازم (American Imperialism) کا ظہور، وغیرہ۔

اِس طرح کے واقعات نے پوری مسلم دنیا میں شدید ردِعمل پیدا کیا۔ ہر جگہ نفرت اور تشدد اور جہاد ایکٹوزم شروع ہو گیا۔ ہر جگہ کے مسلمانوں میں وہی جارحانہ کلچر وجود میں آ گیا جس کی ترجمانی عرب شاعر خیر الدین الزرکلی (وفات: 1976) کے اِن الفاظ سے ہوتی ہے:

هاتِ صلاحَ الدين ثانيةً فينا  جدّدي حِطّين أو شبه حطينا

(صلاح الدین کو دوبارہ ہمارے درمیان لے آؤ۔ حطین یا حطین جیسا معرکہ دوبارہ گرم کرو)

واقعات بتاتے ہیں کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کی دوسو سالہ مدت تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے ''جہاد ایکٹوزم'' کی صدی تھی۔ تمام مسلم دنیا اِس جہاد ایکٹوزم میں شامل تھی، اِس فرق کے ساتھ کہ کچھ لوگ تقریر اور تحریر کی زبان میں نفرت اور تشدد کی بولی بول رہے تھے، اور بقیہ لوگ

باقاعدہ ہتھیاروں کے ذریعے اپنے مفروضہ دشمن کے ساتھ باقاعدہ لڑائی چھیڑے ہوئے تھے، لیکن یہ دوسو سالہ مقابلہ آرائی یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی مغلوبیت پر ختم ہوئی۔

آج ساری دنیا کے مسلمان ایک ہی بولی بول رہے ہیں— ہم مخالفین کی سازشوں سے گھرے ہوئے ہیں، ہم دشمنوں کی معاندانہ کارروائیوں کا شکار ہیں، وغیرہ۔ اِس موضوع پر آج کا مسلم پریس، عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کا خلاصہ ایک جملے میں یہ ہے کہ— ہم محاصرہ کی حالت میں ہیں (We are under siege)۔

## زیرِ سطح امکانات

سطح پر بظاہر وہ حالات تھے جن کو عام طور پر اینٹی مسلم حالات کہا جاتا ہے، لیکن عین اِسی مدت میں زیرِ سطح کچھ دوسری سرگرمیاں بڑے پیمانے پر جاری تھیں۔ یہ سرگرمیاں وہ تھیں جو سماجی اور سیاسی اور علمی سطح پر جاری تھیں۔ اِن سرگرمیوں کے چیمپین بھی مغربی قوموں کے لوگ تھے۔ اِن سرگرمیوں کے نتیجے میں اِس مدت میں دنیا میں مذہبی آزادی آئی۔ جمہوریت کا دور آیا، امن (peace) کو خیر اعلیٰ (summum bonum) کا درجہ دے دیا گیا، رواداری (tolerance) کو ایک عالمی مسلّمہ قرار دے دیا گیا، جدید تقاضوں کے تحت ساری دنیا میں ایک نیا ذہن پیدا ہوا جس کو انسان دوست ذہن (human-friendly mind) کہا جاسکتا ہے۔ پھر اِسی کے ساتھ اِس مدت میں ٹکنالوجی کو غیر معمولی ترقی ہوئی، پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا، الیکٹرانک کلچر وجود میں آیا۔ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے ایک نیا دور پیدا کیا جس کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے۔

اِسی کے ساتھ ایک اور ترقی بہت بڑے پیمانے پر وجود میں آئی جس کو علم یا سائنس کی ترقی کہا جاتا ہے۔ اِس ترقی نے فطرت کے اندر چھپے ہوئے حقائق انسان کے سامنے کھول دئے۔ علم کے تمام شعبوں میں انقلابی تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ یہ تبدیلیاں جو موجودہ زمانے میں پیدا ہوئیں، وہ عین اسلام کے حق میں تھیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے، یہ اُس موافق دور کا ظہور تھا جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن (41:53) میں دی گئی تھی۔

## موافقِ اسلام دور

موجودہ زمانے میں جو تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں، وہ اتنی زیادہ ہیں کہ کوئی انسائکلو پیڈیا بھی ان کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ ان کے بیان کے لیے ایک پوری لائبریری کی ضرورت ہے۔ تاہم مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِن تبدیلیوں کی بنا پر تاریخ انسانی میں پہلی بار ایک نیا دور پیدا ہوا، ایک ایسا دور جس کا تصور قدیم انسان نہیں کرسکتا تھا۔ یہ دور اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مکمل طور پر ایک موافقِ اسلام دور ہے۔

مزید یہ کہ دورِ جدید کے یہ عظیم امکانات تمام تر امن کے تصور پر مبنی ہیں۔ اِن امکانات کو استعمال کرنے کے لیے نہ جنگ کی ضرورت ہے اور نہ کوئی سیاسی ایمپائر قائم کرنے کی۔ اِن جدید مواقع کا یہ ایک حیرت انگیز پہلو ہے کہ ان کو مکمل طور پر پُرامن ذرائع (peaceful means) کے تحت استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اِن جدید مواقع کو استعمال کرنے کے لیے کسی بھی مرحلے میں نہ جنگ کی ضرورت ہے اور نہ پولٹکل پاور کی۔

## سیکولر مثال

اِن صفحات میں جو بات کہی جارہی ہے، وہ صرف ایک مذہبی بات نہیں ہے، یہ دراصل ایک اصولِ فطرت (law of nature) ہے۔ خالق نے جن اصولوں کے تحت اِس دنیا کو بنایا ہے، اُن میں سے ایک اصول یہ بھی ہے۔ اِس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں سطح (on the surface) پر ہوتی ہیں جن کو ہر آدمی دیکھ سکتا ہے، اور کچھ زیادہ بڑی چیزیں ہوتی ہیں، مگر وہ ہمیشہ زیرِ سطح (underneath the surface) ہوتی ہیں۔ اِن دوسری چیزوں کو ہمیشہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو بصیرت (wisdom) رکھنے والے ہیں۔ اِس دنیا میں زیادہ بڑی کامیابی صرف اُن لوگوں کے لیے مقدر ہے جو انڈر کرنٹ چیزوں کو دیکھ سکیں اور اس کے مطابق، اپنے عمل کی منصوبہ بندی کریں۔

اِس کی ایک مثال جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں جاپان محوری گروپ (Axis powers) کے ساتھ تھا۔ اُس زمانے میں جاپان ایک تشدد پسند قوم کی حیثیت رکھتا تھا، لیکن جنگ کے دوران امریکا نے جاپان پر ایٹمی حملہ کیا۔ اس نے جاپان کے دو شہر ہیروشیما (Hiroshima) اور ناگاساکی

(Nagasaki) پر اگست 1945 میں دو ایٹم بم گرائے۔ یہ جاپان کے لیے ایک ہلاکت خیز تجربہ تھا۔ اِس کے بعد جاپان بظاہر پوری طرح ایک تباہ شدہ ملک بن گیا۔

اُس وقت جاپان کا سیاسی لیڈر ہیروہٹو (Hirohito) تھا۔ ہیروہٹو ایک مدبر آدمی تھا۔ اس نے اپنی بصیرت سے یہ جانا کہ سرفیس پر جو حالات ہیں، وہ بظاہر جاپان کے لیے ناموافق ہیں، لیکن انڈر کرنٹ جو صورتِ حال ہے، وہ جاپان کے لیے ایک موافق امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔

اُس وقت کی دنیا میں دو بڑی طاقتیں تھیں — روس اور امریکا۔ دونوں ملک بھاری مصنوعات (hardware) میں مشغول تھے اور ہلکی مصنوعات (software) کا میدان تقریباً خالی تھا۔ جاپان نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس حقیقت کو جانا اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ اِس مخفی امکان کو استعمال کرے۔

اِس کے بعد جاپان نے دو کام کیے۔ ایک طرف، جاپان نے یہ کیا کہ اس نے امریکا سے ٹکراؤ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا، اور اپنی ساری توجہ تعلیم اور صنعت کے میدان کی طرف موڑ دیا۔ اِس کے بعد جو ہوا، وہ یہ کہ تقریباً 30 سال کے اندر جاپان کی ایک نئی تاریخ وجود میں آ گئی۔ جاپان نے نہ صرف جنگ کے نقصانات کی تلافی کر دی، بلکہ اس نے اتنی ترقی کی وہ جدید دور میں اقتصادی سپر پاور (economic superpower) بن گیا۔ یہ معجزہ اِس طرح پیش آیا کہ جاپان نے سرفیس کے حالات کو نظر انداز کیا اور انڈر کرنٹ جو امکانات چھپے ہوئے تھے، ان کو استعمال کیا۔

اِس معاملے کی دوسری مثال وہ ہے جو انڈیا میں پیش آئی۔ انڈیا میں تقریباً 200 سال تک برٹش حکومت قائم رہی۔ 1857 میں انڈیا میں آزادی کی لڑائی شروع ہوئی۔ یہ لڑائی ہتھیاروں کے بل پر شروع کی گئی تھی۔ اِس جنگ میں کچھ مسلم لیڈر اور کچھ ہندو لیڈر شریک تھے۔ آزادی کی یہ جنگ تقریباً 60 سال تک جاری رہی، مگر اس کا نتیجہ تباہی کے سوا کسی اور صورت میں نہیں نکلا۔ آخر کار 1919 میں مہاتما گاندھی سیاست کے میدان میں آئے اور انھوں نے جنگ آزادی کی قیادت سنبھالی۔ اُس وقت انڈیا بظاہر ایک تباہ شدہ ملک بنا ہوا تھا، لیکن مہاتما گاندھی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اِس حقیقت کو جانا کہ یہاں انڈر کرنٹ ایک اور صورتِ حال موجود ہے جو انڈیا کے لیے ایک موافق امکان کی حیثیت

رکھتی ہے۔شرط صرف یہ ہے کہ تشدد کا طریقہ چھوڑ کر امن کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

یہ انڈر کرنٹ امکان کیا تھا، وہ یہ تھا کہ جس زمانے میں برطانیہ انڈیا پر حکومت کر رہا تھا، اُسی زمانے میں یورپ کے ملکوں میں شاہی خاندان راج کر رہے تھے—اِن یورپی ملکوں میں اِن حکومتوں کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر تحریکیں اٹھیں۔بڑے بڑے یورپی دماغوں نے یہ نظریہ پھیلایا کہ کسی خاندان کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی ملک پر حکومت کرے۔اِس سیاسی تحریک کے نتیجے میں ایک سیاسی اصول پورے یورپ میں ایک مسلّم اصول بن گیا۔ اِس اصول کو عام طور پر حکومتِ خود اختیاری (self-determination) کا اصول کہا جاتا ہے:

The right of a people to decide upon its own form of government without coercion or outside influence.

یہ سیاسی انقلاب یورپ میں پہلے فکری سطح پر آیا۔اس کے بعد اس نے عملی صورت اختیار کی۔ اِس سیاسی انقلاب کا پہلا عملی اظہار فرانس میں ہوا۔یہ فرنچ ریولوشن (French Revolution) تھا جو 1789 میں پیش آیا۔اِس انقلاب کے بعد فرانس میں شخصی بادشاہت ختم ہوگئی اور جمہوری حکومت قائم ہوگئی۔دھیرے دھیرے یہ انقلاب پورے یورپ میں پھیل گیا۔

مہاتما گاندھی نے اِس سیاسی مسلّمہ کو استعمال کیا۔انھوں نے کہا کہ خود یورپ کے حالات بتاتے ہیں کہ اب بادشاہت کا دور ختم ہو چکا ہے اور ہر ملک کو حق ہے کہ وہ اپنے یہاں قومی حکومت قائم کرے۔ مہاتما گاندھی نے اِس اصول کو لے کر انڈیا کی تحریک آزادی کو نیا رخ دے دیا۔انھوں نے تشدد کا طریقہ چھوڑ کر پورے معنوں میں پرامن طریقہ اختیار کیا، جس کو وہ اہنسا (non-violence) کہتے تھے۔مہاتما گاندھی کی یہ پرامن جدوجہد آزادی برٹش حکومت کے لیے نیا مسئلہ بن گئی۔انھوں نے محسوس کیا کہ پہلے، جدوجہد آزادی کو دبانا آسان تھا۔کیوں کہ وہ لوگ برٹش حکومت کے خلاف ہتھیار استعمال کرتے تھے۔اِس طرح برٹش حکومت کو موقع ملتا تھا کہ وہ ان کے خلاف ہتھیار استعمال کر کے انھیں کچل دے۔اِس تبدیلی نے برٹش حکمرانوں سے ہتھیار کے استعمال کا جواز چھین لیا۔اِس صورت حال کا

اندازہ ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں ایک برٹش کلکٹر نے اپنے سیکریٹریٹ کو یہ تار بھیجا— براہِ کرم، بذریعہ ٹیلی گرام یہ بتایئے کہ ''شیر'' کو ہتھیار کے استعمال کے بغیر کیسے ہلاک کیا جائے:

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

یہ ایک سیکولر مثال ہے کہ کس طرح ایک لیڈر نے اپنے زمانے کے انڈر کرنٹ حالات کو سمجھا اور کامیابی کے ساتھ اس کو استعمال کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ اصول فطرت کا ایک اصول ہے۔ یہ ایک فطری امکان ہے جو ہمیشہ اور ہر صورتِ حال میں موجود رہتا ہے۔ اِس امکان کو ہر بڑے مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ سیکولر مقصد ہو یا مذہبی مقصد۔ یہی امکان موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے لیے پوری طرح موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کر کے حکیمانہ انداز میں اس کو استعمال کیا جائے۔

## فضلِ عظیم کا معاملہ

قرآن کی سورہ النساء میں ایک آیت اِن الفاظ میں آئی ہے: وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (4:113) یعنی اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو اُن میں سے ایک گروہ نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ تم کو بہکا کر رہے گا، حالاں کہ وہ اپنے آپ کو بہکا رہے ہیں، وہ تمھارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تم کو وہ چیز سکھائی ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے، اور اللہ کا فضل ہے تم پر بہت بڑا۔

قرآن کی اِس آیت میں 'فضل' کا لفظ کسی پُراسرار معنی میں نہیں ہے۔ فضل کے لفظی معنی ہیں: زیادہ یا شئ مزید (additional thing)۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے علاوہ ایک مزید چیز دی گئی جو کہ ختم نبوت کا رول ادا کرنے کی نسبت سے آپ کے لیے ضروری تھی، یعنی وہ اسباب یا مواقع جن کو استعمال کر کے آپ خاتم النبیین کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دے سکیں۔ مثلاً ہاجرہ اور

اسماعیل کے ذریعے سے ایک نئی نسل کی تیاری جس کا ذکر قرآن کی سورہ ابراہیم (14) کی آیت نمبر 37 میں کیا گیا ہے، یا ساسانی ایمپائر اور بازنطینی ایمپائر کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر دونوں کو کمزور کر دینا، جس کا اشارہ قرآن کی سورہ الروم کی آیت نمبر 2 میں کیا گیا ہے۔ مذکورہ آیت (4:113) میں اِسی قسم کی نصرت مراد ہے، نہ کہ پُراسرار قسم کی کوئی شخصی فضیلت۔ نصرت کا یہ خصوصی معاملہ پیغمبر کے مشن کی نسبت سے تھا، نہ کہ پیغمبر کی ذات کی نسبت سے۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں علم کی تعلیم (وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ) سے مراد علمِ وحی نہیں ہے، بلکہ اِس سے مراد مذکورہ قسم کے موافق امکانات سے پیغمبر کو باخبر کرنا ہے۔ یہی اسلوب سورہ الفتح (48) میں اختیار کیا گیا ہے جہاں 'علم ما لم تعلموا' کا لفظ آیا ہے۔ سورہ الفتح کی اِس آیت میں علم سے مراد وہ موافق امکانات ہیں جو معاہدہ حدیبیہ کے اندر باعتبار نتیجہ چھپے ہوئے تھے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالی نے پچھلے زمانوں میں ہزاروں سال کے دوران بہت سے پیغمبر بھیجے (23:44)۔ اِن پیغمبروں نے نبوت کا فریضہ پوری طرح انجام دیا، لیکن ان کا مشن صرف اعلانِ توحید تک پہنچا۔ اُن میں سے کسی کے زمانے میں نہ مطلوب قسم کی امت بنی اور نہ دینِ خداوندی کا متن محفوظ ہو سکا اور نہ توحید پر مبنی عمومی انقلاب آیا، جو کہ اللہ تعالی کو مقصود تھا۔

یہی وجہ تھی جس کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کے لیے اللہ تعالی نے خصوصی اسباب فراہم کیے۔ اِن اسباب کو استعمال کر کے یہ ممکن ہوا کہ دنیا میں توحید پر مبنی انقلاب آئے اور دینِ خداوندی کی نئی تاریخ بنے۔ پیغمبر اسلام کے لیے وحی کے علاوہ، جو مزید موافق اسباب فراہم کیے گئے، انھیں کو قرآن میں فضل کہا گیا ہے، یعنی اضافی اسباب یا مزید نصرت۔ اللہ تعالی نے ایک لمبی مدت کے اندر یہ اضافی اسباب فراہم کیے، یہاں تک کہ رسول اور اصحابِ رسول کے لیے یہ ممکن ہو گیا کہ اِن اسباب کو استعمال کر کے وہ اللہ تعالی کے منصوبے کی تکمیل کریں۔

قرآن کی مذکورہ آیت میں 'وعلّمك ما لم تكن تعلم' اُس وحی کے لیے نہیں ہے جو قرآن کی سورت میں آپ پر نازل ہوئی۔ بلکہ اِس سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق مذکورہ موافق امکانات

سے ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر اِن موافق امکانات کی خبر دی، تاکہ آپ شعوری طور پر اِن امکانات سے واقف ہوں اور ان کو اپنے مشن کے حق میں استعمال کر سکیں۔

6 ہجری میں پیغمبر اسلام اور قریش کے درمیان حدیبیہ کے مقام پر جو معاہدہ ہوا تھا، وہ اس معاملے کی ایک واضح مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، حضرت عمر فاروق کو اِس معاہدے پر سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس کا ایک حصہ کتابوں میں اِس طرح نقل ہوا ہے: قال عمر: فأتيتُ أبابكر، فقلتُ يا أبابكر، أليس هذا نبي الله حقاً؟ قال: بلى - قلت: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل؟ قال: بلى، قلتُ: فلم نعطي الدنية في ديننا إذاً؟ قال: أيها الرجل، إنه رسول الله وليس يعصي ربه، وهو ناصره، فاستمسك بغرزه، فوالله إنه على الحق - (تفسير ابن كثير 4 / 199) یعنی عمر فاروق کہتے ہیں کہ پھر میں ابوبکر کے پاس گیا۔ میں نے کہا کہ اے ابوبکر، کیا رسول اللہ نبی برحق نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ضرور آپ نبی برحق ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا ایسا نہیں ہے کہ ہم حق پر ہیں اور ہمارا دشمن باطل پر ہے۔ انھوں نے کہا کیوں نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر کیوں ہم اپنے دین کے معاملے میں ذلت کو اختیار کریں۔ ابوبکر نے کہا کہ اے شخص، وہ اللہ کے رسول ہیں۔ وہ کبھی اپنے رب کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اللہ ضرور ان کی مدد کرے گا۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو لازم پکڑو۔ خدا کی قسم، وہ حق پر ہیں۔

## دورِ جدید کی مثال

قرآن کی مذکورہ آیت میں اللہ کے جس 'فضل عظیم' کا ذکر ہے، اس کا ظہور صرف ایک بار نہیں ہوا، بلکہ خدا کی دوسری رحمتوں کی طرح وہ بھی تاریخ میں بار بار دہرایا جا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ فضل یا اضافی نصرت بہت بڑے پیمانے پر ظاہر ہو چکی ہے۔ اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو پہچانیں اور اس کو خدائی مشن کے حق میں بھرپور طور پر استعمال کریں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اِس لیے بھیجا، تاکہ وہ سارے عالم کو امرِ حق سے آگاہ کر دے (25:1)۔ اِس آیت میں جس عالمی نشانے کا ذکر ہے، وہ اول دن سے مطلوب تھا،

مگر اللہ کے تخلیقی نقشے کے مطابق، اِس دنیا میں کسی نشانے کی تکمیل کراماتی طور پر نہیں ہوتی، بلکہ وہ اسباب کے ذریعے ہوتی ہے۔ اِس عالمی دعوتی نشانے کو انجام دینے کے لیے قدیم زمانے میں عالمی مواصلات کا نظام عملاً موجود نہ تھا، اِس بنا پر مطلوب نشانہ بھی قدیم زمانے میں پورا نہ ہوسکا۔

اِس مقصد کے لیے اللہ تعالی نے تاریخ میں ایک نیا پراسس جاری کیا۔ اِس پراسس کی تکمیل باقاعدہ طور پر انیسویں صدی میں ہوئی۔ انیسویں صدی اور اس کے بعد کی صدی میں وہ تمام اسباب وجود میں آگئے جو دینِ حق کی عالمی پیغام رسانی کے لیے ضروری تھے۔ آج جس چیز کو دورِ مواصلات کہا جاتا ہے، وہ دراصل اِسی خدائی منصوبے کے تحت وجود میں آیا ہے۔

یہ دورِ مواصلات اور اِس نوعیت کے دوسرے تائیدی ذرائع گویا کہ دورِ جدید کے 'فضلِ عظیم' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ساتویں صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام کو اُس زمانے کے اعتبار سے فضلِ عظیم یا موافق اسباب دئے گئے تھے، موجودہ زمانے میں پیغمبر کی امت کو دوبارہ جدید تقاضوں کے مطابق، فضلِ عظیم یا موافق اسباب عطا کیے گئے ہیں۔ اب امت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے فضلِ عظیم کو پہچانے اور اس کو استعمال کرکے اپنے آپ کو اللہ کی عظیم سعادتوں کا مستحق بنائے۔ (15 ستمبر 2012)

---

صدر اسلامی مرکز کے آڈیو اور ویڈیو لیکچرز کے لیے حسب ذیل لنکس ملاحظہ ہوں:

www.cpsglobal.org/videos.

www.alquranmission.org/podcasts.aspx.

قرآن کی عمومی اشاعت میں حصہ لینے کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

1. Fill the form at: www.alquranmission.org/QuranDistributor.aspx

Or

2. Send us a postcard with your Al Risala Numbe, Name, Complete Postal Address, Mobile number, Email id and the Area in which you would like to spread the Quran to the following address:

Al-Quran Mission
1, Nizamuddin West Market
New Delhi- 110013

# ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔ الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے او پر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

## ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن 33 فی صد ہے۔ 50 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 40 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ 2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ 3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

## زرتعاون الرسالہ

| ہندستان کے لئے | | بیرونی ممالک کے لئے (ہوائی ڈاک) |
|---|---|---|
| ایک سال | Rs. 150 | $20 |
| دو سال | Rs. 300 | $40 |
| تین سال | Rs. 450 | $60 |

---

**Rahnuma-e-Zindagi**
**by**
**Maulana Wahiduddin Khan**
**ETV Urdu**
Tuesday and Thursday 5.00 am

---

**ISLAM FOR KIDS**
**by**
**Saniyasnain Khan/Maria Khan**
**ETV Urdu**
Every Sunday 9.00 am

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2012-14
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2012-14

## Bringing you a splendid range of Islamic books and children's products

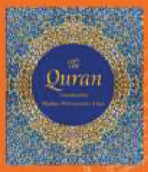


The Quran, a book which brings glad tidings to mankind along with divine admonition, stresses the importance of man's discovery of truth on both spiritual and intellectual planes.

Peace, always desirable for its own sake, has been vital to human progress in every age. The difference now in this nuclear age is that it has literally become a matter of life and death for humanity.

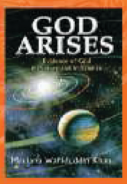


This book, the result of 30 years spent by the author in exhaustive research, attempts to present the basic teachings of religion in the light of modern knowledge and in a manner consistent with modern scientific method.

In this series, Maulana Wahiduddin Khan has presented the fundamental teachings of Islam in a simple way.

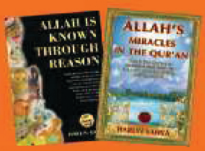


Harun Yahya's books have been instrumental in helping many to return to their faith in Allah, and, for many others, a deeper insight into their faith.

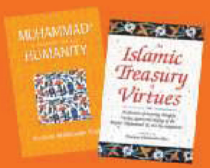


A collection of biographies, and traditions regarding the words and deeds of Prophet Muhammad.

*New Releases...*

**Goodword**
www.goodwordbooks.com

AL-RISALA (URDU) MONTHLY
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi - 110 013